لہو آستیں کا
(ناول)
لہو آستیں کا
محسن علی
محسن علی

انتساب

نکہت

الیقی اور بیتن کے نام

میری زندگی کے یہی تین نام

زیر اہتمام : انور مسعود

سرورق : قیصر سرمست

بار اول : دسمبر ۱۹۷۹ء

تعداد : ۱۰۰۰

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

قیمت : ۱۲ روپیہ

بہ اعانت آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد

ناشر : شاہد پبلیکیشنز نیا ملک پیٹ حیدرآباد ۳۶
مطبوعات نمبر (۳۱)

ملنے کے پتے :

۱۔ دفتر سنگ آزاد، حجت بازار، حیدرآباد؛ شاہد پبلیکیشنز، برانچ آفس، مشیرآباد، حیدرآباد

۲۔ حسن علی، فلیٹ ۴۰۲، کنگ نادر، چوتھی منزل، بشیر باغ حیدرآباد

۳۔ مکتبہ جامعہ، بمبئی، دہلی، علیگڈھ : اردو اکیڈیمی بک ڈپو خیریت آباد حیدرآباد

شائع ہو چکی ہیں۔ اور انکی صلاحیتوں کا تنوع میدانِ ادب میں بھی ادب کی مختلف اصناف
میں ان کے لیے جگہ بنا لیتا۔

انھوں نے کتنی ہی اچھی کہانیاں لکھی ہیں اور ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی بہت
مقبول ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے انکے ڈراموں کا یا کہانیوں کا کتاب ہاتھ سے ہاتھوں میں
ہونا چاہیئے تھی لیکن محسن علی نے اپنے قاری کو ناول تھما دیا کہ ان کے اعتماد کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔
"ہوا سیتی کا" محسن علی کا پہلا ناول ہے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو دو چار سطروں کے بعد
ہی اس حد تک گرفت میں لے لیتا کہ وہ اپنے اطراف سے کٹ کر رہ جائے" کامیاب تکنیک کا ایک
لائقِ اعتنا وصف ہے۔ محسن علی نے اپنے اس ناول میں کچھ اس انداز سے وشالی کو متعارف کرایا
ہے کہ قاری پہلی نظر ہی اس کردار کا ہمدرد و بہی خواہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس
کردار کی شخصیت ذہن و دل کا جزو بنتی جاتی ہے۔ لگتا ہے ناول کے ختم کرنے تک ہم کسی امراؤ
جان ادا (مرزا ہادی رسوا) یا کسی شمی جان (سرفراز حسین عزمی) سے زیادہ تیکھی صورت سے
مل سکیں گے۔ بیسویں صدی کی تقریباً آخری دہائی تک پہنچتے پہنچتے عصری حسیت کے زیر اثر
وشالی کی شخصیت زیادہ پہلودار ہو گئی ہے۔

ان چند سطری اقتباس سے اس ناول کے آغاز میں ہی ذہن پر اس کی گرفت کی قدرت
کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"وشالی کی زندگی کے سارے ہی واقعات مجھے معلوم ہیں۔ وہ واقعات کچھ اس قدر
دلچسپ اور دلفریب ہیں کہ اس کی رنگا رنگ شخصیت کے لیے ہمیشہ ہی بڑی ہی
پرکشش رہی ہے۔ وہ عورت جو انھوں نے رتبہ بلند کی صورت تھی۔ ایک خود مختار
حکمران ملکہ سے کم نہ تھی۔ چاہتی تو کسی ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی۔
وشالی میری ماں تھی۔
اس نے ٹھیک پندرہ سال جیل میں کاٹے تھے جس وقت وہ مجھ سے بچھڑ گئی تھی

اس وقت میری عمر تین سال تھی۔ پندرہ سال جیل میں کاٹنے کے بعد جیل ہی میں ایک دن وہ خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس واقعہ کو گذشتہ اٹھارہ سال ہو گئے تھے۔

ان الفاظ میں وشالی سے متعارف ہونے کے بعد آپ کا تجسس اس بائیس سالہ نوجوان دوشیزہ کی تلاش کرنے لگتا ہے جس نے وشالی کے بطن سے جنم لیا ہے اور جس نے اپنی ماں کا تعارف اس انوکھی صداقت سے کروایا ہے۔ لیکن محسن علی نے چابکدستی سے آخر تک اس کردار کو پردۂ اخفا میں رکھا ہے۔

وشالی، راجہ اور رکمنی کے کرداروں کی تثلیث نے ناول میں آخر تک اس زندگی کا محاسبہ کیا ہے جس کے پیچھے پیچھے تخریبی اعتبار سے انہیں اپنی انفرادیت اور انا کے ہاتھوں غم و آلام کو شخصیت کا جزو بنا لینے میں عار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اپنے پندار کی شکست میں بھی انہوں نے معاشرے کے استحصال سے نبرد آزما رہنے کی سعی کی ہے۔

راجہ کا کردار یقیناً ایسے مرد کا کردار ہے جس نے زندگی کی کلائی مروڑ دینے ہی کو اپنا شعار کر رکھا ہے جو کسی بھی صداقت کے آگے سر تو جھکا سکتا ہے لیکن کسی مصلحت کے آگے سر خم نہیں کر سکتا۔ وشالی جیسی الجھن در الجھن، انانیت زدہ نسائیت کے لیے راجہ جیسی خود پسند مردانگی ہی کی ضرورت تھی جو تیور سے بوہیمین BOHEMIAN بھی ہے۔ لیکن اس تثلیث میں رکمنی ایک ایسا کردار ہے جس نے زندگی کو نچوڑنے کی بجائے زندگی کو نکھارنے میں تسکین انا پائی ہے۔ وہ صرف دینا جانتی ہے لینا اسے آتا ہی نہیں۔ وشالی اور راجہ کے کرداروں کی استقامت بعض وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ رکمنی کی قربانی کی رہین منت ہے اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سپنا جیون، یا قربانی کے ہر دکھ کو اپنی زندگی بنا لینے والی رکمنی اس تثلیث کی پیدا کردہ پیوستہ دل و دماغ کی تشنگی میں وہ ساز لگتی ہے جس کے نیم شکستہ تاروں میں سُر اور سنگیت کا ایک جہان معنی آباد ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے محسن علی نے اس ناول کو ڈرامائی ناول DRAMATIC NOVEL کہا جا سکتا ہے۔ تقریباً سارے ہی کردار ورنگ نشر و نما میں محسن علی نے مکالموں سے اس حد تک کام لیا ہے کہ حق و باطل کے تنازعہ میں کردار اپنی گفتگو ہی سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ مکالموں کی برجستگی اور ان کی معنوی تہہ داری کرداروں کے جذبات و احساسات کی اس خوبی سے عکاسی کرتی ہے کہ مکالمے کرداروں کی شخصیت کا جز ہو جاتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اظہار کے وسیلے کے لیے الفاظ کے انھیں پردوں کی ضرورت تھی جن کے پیچھے سے کردار کبھی جھانکنے لگتے ہیں، کبھی پردہ نوچ کر یہ اضطرار باہر نکل آتے ہیں۔

اب آپ کو محسن علی ہی کے الفاظ میں رکمنی سے ملاتا چلوں کہ یہ الفاظ مکالموں سے ہی شخصیت کی تعمیر کر رہے ہیں۔

"۔۔ ایک دن رکمنی نے شیام سے کہا۔ شیام تم صرف ایک کلاکار ہو۔ انسان نہیں ہو۔ اس لیے تم نہیں جان سکتے کہ میں کیا ہوں"

شیام نے مسکرا کر کہا۔ "میں سب جانتا ہوں"۔

"جانتے ہو تو پھر سمجھ کیوں نہیں لیتے۔" رکمنی نے کہنا شروع کیا۔ "گھڑیاں گھنٹوں میں بدل گئیں۔ گھنٹے دنوں میں۔ دن مہینوں میں۔ اب ایک ایک پل ایک ایک دن لگتا ہے اور دن، ایک ایک مہینہ۔ میں صرف راہ دیکھ رہی ہوں۔ صرف انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لگتا ہے تم مجھ تک پہونچ جاؤ گے۔ مجھ سے ہو کر گذر جاؤ گے تو بھی شاید میں انتظار ہی کرتی رہوں گی۔۔۔

ساری باتیں سن کر شیام نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا "تم ایک مہان کلاکار ہو"

محسن علی نے کردار کی تعمیر کے لیے اس مکالمے میں بڑے بلیغ اشارے کیے ہیں۔ "تم مجھ تک پہونچ جاؤ گے" "مجھ سے ہو کر گذر جاؤ گے۔ تو بھی شاید میں انتظار ہی کرتی رہوں گی۔"

اس طرح رکمنی اپنی عدم تکمیل ہی کو اپنی فنکارانہ زندگی کا اثاثہ سمجھتی ہے۔ اس کو شدید احساس ہے کہ اس زمین سے اس کی جڑیں چھوٹ گئی ہیں جس کی وہ پروردہ ہے۔ آگے چل کر رکمنی کے روپ میں عورت کی جبلی رجعت کو اس کے جذبات کی عمیق گہرائی سے گذار کر محسن علی نے رد عمل کے طور پر اس کردار کو [illegible] کا شکار بنایا ہے۔ بادی النظر میں شیام کا کردار اس کا ذمہ دار لگتا ہے کہ رکمنی کا عدم تکمیل کا یہ بھی ایک پہلو ہے لیکن پانچ سال کی عمر میں ماں کی موت، باپ کا سنیاس، بھائی کی فوج میں بھرتی، گھر بار سے چھوٹ کر تہذیب زدہ زندگی کا کرب اور پھر مصنف کا فن کار کے تعلق سے مادرانہ تصور ہی دراصل اس نے اپنا کو جنم دیتا ہے چنانچہ مہذب زندگی سے روگردانی اور غیر مہذب زندگی کی طرف مراجعت کی تمنا بھی اسی جذبہ کا المناک پہلو ہے۔ ناول کے چند ہی صفحات کے بعد رکمنی نے شدید ہیجانی جنسی کیفیات میں بھی انحراف کا ایک پہلو اسی خواہش کی بنا پر نکال لیا ہے کہ شیام اس کو ان جذبات کی پذیرائی اور آسودگی کے لیے جنگل کو لے چلے۔

چنانچہ رکمنی شیام سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

... چلو نا چل کر کسی جنگل میں رہیں۔ میرا ارمان ہے کہ ہم خطروں میں گھر جائیں تم اپنی مہارت کے ساتھ ان سارے خطروں سے نمٹا لیں۔ تم پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دوں گی۔ جنگل کے پھل پات کھائیں گے۔ گھنی پہاڑی میں رہیں گے... میں کبھی زور سے چیخ پڑوں گی جب اچانک میرے سامنے کوئی وحشی جانور آ جائے گا تم فوراً اس پر حملہ کر دو گے اور مجھے بچا لو گے تو میں اپنی دھرتی اور سارا آکاش تم پر سو سو بار قربان کر دوں گی .... جواب میں شیام نے والہانہ انداز میں رکمنی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس کی آنکھوں، اس کے ہونٹوں اور بازو پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ رکمنی کسمسا گئی، پھر تڑپ کر اس سے اور چمٹ گئی ___ لیکن ساتھ ہی شیام کے بوسوں کو روکتے

پہنچتا ہے ملک کے کسی گوشے میں پہنچنے سے جگہ بنا لینے کی اہمیت نہیں دیتا۔ محسن علی یہاں اس طرح کامیاب پہنچا کہ مرزی کے کردار سے انہوں نے بین السطور میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرزی ایک ایسے غیر منطقی اور پھر آئینی معاشرتی استبداد کا علامتی SYMBOL ہے جس کو اس کا معاشرہ دل تک رسائی کی اجازت ہی نہیں دیتا اور جسم کا محتاج لمس زیست کا کل اثاثہ ٹھہرتا ہے

معاصر سید نام ناول کے ان اجزائے ترکیبی کو جنھیں پلاٹ اور کردار کہتے ہیں بے حد اہمیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

کردار نگاری موجودہ دور کی ناول نگاری کا اہم ترین جزو ہے اور پلاٹ کی بنیاد بھی کچھ اسطرح ہونی چاہیئے کہ کرداروں کے بارے میں کوئی امر واقعہ ان کی شخصیت کی تکمیل میں تشنہ نہ رہ جائے۔

یہ بات یہاں بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ محسن علی کا قلم ناول نگاری کے میدان کا بڑی خوبی سے متحمل ہو سکا ہے، جو اپنی تکنیک میں بکھر بکھر کر آخر میں زنجیر در زنجیر ہو جاتی ہے۔ محسن علی کا یہ ناول اپنے کرداروں کی انفرادیت اور تنوع کے باعث ایک کامیاب ناول ہے اور ان کرداروں کے بارے میں کوئی امر واقعہ ان کی شخصیت کی تکمیل میں تشنہ نہیں ہے

اقبال متین
بی۔ٹی۔ ۲۵
دردھ کا ٹوں کالونی، پوچم پاڈ پراجیکٹ

وشالی کی زندگی کے جتنے بھی واقعات مجھے معلوم ہیں۔ وہ واقعات کچھ اس قدر دلچسپ اور دلفریب ہیں کہ اس کی رنگا رنگ شخصیت میرے لیے ہمیشہ ہی سے بڑی پُرکشش رہی ہے۔

وہ تو ہمارا نیولیک کے رتبہ کی عورت تھی۔ ایک خود مختار حکمران ملکہ سے کم نہیں تھی۔ چاہتی تو کسی ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی۔

وشالی میری ماں تھی ___

اُس نے ٹھیک پندرہ سال جیل میں کاٹے تھے۔ جس وقت وہ مجھ سے بچھڑی تھی اس وقت میری عمر تین سال تھی ___ پندرہ سال جیل میں کاٹنے کے بعد جیل ہی میں ایک دن وہ خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی ___ وہ واقعہ گزرے آج چار سال ہونے آئے ہیں۔

کہتے ہیں وہ اپنے زمانے کی ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ میں اپنے بچپن ہی سے اس کی کہانیاں سنتی رہی ہوں۔ اس کی کہانیوں میں کوئی دُکھ نہیں ___ اُس کے جیل جانے کی کہانی سُن کر بھی مجھے کبھی اُس پر ترس نہیں آیا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے میرے باپ کا خون کر دیا تھا ___ لوگ ایسا کہتے ہیں، ورنہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اصلی خونی میری ماں نہیں تھی، کوئی اور تھا ___

میری ایک رشتہ کی ماسی تھی، جس نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ اُسے بھی

لگتا ہے اپنی بہن سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا ۔۔ میری ماں ہی مجھے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ میں بھی اپنی ماں کی طرح بہت ہی خوبصورت اور تندرست ہوں ۔۔ میری ماں سی کا کہنا ہے کہ وشالی کی زندگی اس کی خوبصورتی نے تباہ کی ۔

وشالی کچھ اتنی دلکش اور مغرور عورت تھی کہ کئی مرد اس پہ جان دیتے تھے ۔ اس کی دہلیز پہ ماتھا رگڑتے تھے لیکن اس نے کبھی ان پہ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی تھی ۔

اس نے اپنی کم عمری ہی میں شاید زندگی کی اصلیت کو سمجھ لیا تھا ۔ اپنی سرپٹ دوڑتی جوانی کی باگ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھام لی تھی ۔ اسی لیے شاید جس رخ پر چاہا اس نے اپنی باگ موڑلی اور زندگی کے کٹھن مرغزاروں کا سفر کر لیا ۔ کیسے ہی خطرناک موڑ آئے اس کی زندگی میں لیکن ان سے وہ اس طرح گذر گئی جس طرح کوئی سیدھے صاف راستے سے گذر جاتا ہے ۔

اس نے جیل سے میرے نام ایک خط لکھا تھا ۔۔ وہ خط میں نے اپنے پاس محفوظ رکھ لیا ہے ۔ جب کبھی میں زندگی کی کسی الجھن میں پھنس جاتی ہوں، وہ خط نکال کر پڑھ لیتی ہوں ۔ وہ خط میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے ۔ اس خط میں میری ماں نے ہماری جدائی یا فرقت کا رونا نہیں رویا تھا نہ اس نے کسی دکھ بھرے انداز میں اپنے پیار کا اظہار کیا تھا ۔ اس نے مجھے لکھا تھا ۔

"زندگی بہت ہی سیدھی سادی چیز ہے ۔۔ تم دوسروں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا ۔ ہر آدمی میں سوچ سمجھ کر جینے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ جو لوگ تم سے ہمدردی جتائیں گے وہ کبھی تمہارے کام نہیں آئیں گے ۔

عورت کی زندگی میں شادی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے ۔ تم شادی کرنا چاہو تو کر لو لیکن صرف اگر تمہارا جی چاہے، ورنہ نہیں ۔۔ شادی کے معاملے میں ایک بات

(۳)

یہ شاید اتفاق کی بات ہو کہ وہ رات پورنماشی کی رات تھی۔ مندر سے لوٹنے کے بعد وشاکی نے اپنے ہونے والے ور کے نام ایک پیام بھیجا تھا ۔۔۔ "اس سے پہلے کہ میں شادی کی تجویز منظور کروں، ایک بار میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر ہمت ہو تو رات کے دس اور گیارہ بجے کے بیچ ندی کے کنارے جہاں برگد کا پیڑ ہے، مجھ سے آکر ملو۔ اگر نہ آسکو تو اپنی مردانگی کا ثبوت یوں دینا کہ زندگی بھر پھر کسی عورت سے بیاہ نہ کرنا ۔۔۔ گیارہ بجے کے بعد میں وہاں نہیں ملوں گی۔"

ملاقات کے اس بے باک پیام کو دیکھ کر راجہ کچھ سٹپٹا گیا تھا اور یہ سوچنے لگا تھا کہ شادی کی پیش کش کر کے وہ کسی جرم کا ارتکاب تو نہیں کر بیٹھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ اٹھا اور ملاقات کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ جیسے کسی سوئمبر کی تیاری کر رہا ہو جہاں اس کا کوئی حریف نہیں سوائے اس ہستی کے جو اس کی جیون ساتھی بننے والی ہے۔

گھر سے باہر بندھے شب رنگ گھوڑے کی پیٹھ کو اس نے پیار سے تھپکا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "آج ایسے سینہ سپر ہو کر چلنا کہ تیری چال کی تمکنت کو دیکھ کر ہی غنیم سرنگوں ہو جائے، اور اس سے پہلے کہ میں نیچے اتر دوں، غنیم آکر میری رکاب تھام لے۔" گھوڑا زور سے ہنہنایا اور دلار سے اپنا مالک کے ٹھوڑے جیسے بازوؤں پر اپنے ریشمی ایال بکھیر دیئے۔

اپنے جوانی گھوڑے کے تڑپتے ہوئے رگ پٹھوں کو اپنی مضبوط اور بھری بھری رانوں میں دبا کر تلا کی طرح وہ اپنے گھر سے نکل پڑا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چاندنی میں ارمانوں کے پھولوں کی سی تازگی تھی، ٹھنڈک تھی۔ گھوڑے کی سیاہ رنگت پر چاندنی اس طرح دمک رہی تھی جیسے اس کے عضو عضو سے چنگاریاں

چھوٹ رہی ہوں۔ سوار نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ گھوڑا اس طرح
دوڑ رہا تھا جیسے اُسے زمین پہ دوڑنا نہ ہو بلکہ ہواؤں میں اُڑتے ہوئے آسمانوں
کی طرف جانا ہو۔ اُس کی ٹاپوں سے راستے کی گرد اس طرح اُڑ رہی تھی جیسے چاندنی
کی سفیدی میں زمین پر دُور تک کہکشاں بکھر گئی ہو۔ اس کہکشاں کو روندتا ہوا
کالے گھوڑے کا سوار کچھ اس طرح آگے بڑھ رہا تھا کہ فضا میں بکھرا ہوا سناٹا
گھوڑے کی دہشت ناک ٹاپوں سے دہل رہی تھی۔ جب وہ گاؤں سے باہر میدان
میں آ گیا تو کسی خیال سے یکلخت اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ گھوڑے نے
اپنے نعل اس طرح زمین میں دھنسا دیئے جیسے سامنے دیوار آ گئی ہو۔ سوار نے اپنے
چاروں طرف نظر ڈالی۔ پیار سے گھوڑے کی گردن تھپتھپائی۔ دونوں پسینے میں
شرابور تھے۔ سوار نے نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پہ ایک
مسکراہٹ سی پھیل گئی — اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کا رُخ پھر
گاؤں کی طرف پھیر دیا۔ جب اُس نے ایڑ لگائی تو گھوڑا بجائے پیچھے مڑنے کے
الف ہو گیا اور گاؤں کی طرف بڑھنے سے انکار کر دیا۔ سوار نے اس طرح چمکارا
جیسے پیار بھرا غصہ کرتے ہوئے گھوڑے کو منا رہا ہو — گھوڑا گاؤں کی طرف
دوڑ پڑا اُسی تیزی سے فضا کو دھواں دھار کرتا ہوا —

گاؤں میں پہنچ کر وہ سرائے کے پاس کے بوڑھے چھتنار پیپل کے سائے میں
یکلخت رک گیا — بوڑھا پیپل ٹھنڈی چاندنی میں بہکتی ہوئی ہواؤں کے لمس سے
کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ سوار گھوڑے سے نیچے اُتر پڑا اور گھوڑے کو بوڑھے
پیپل کے حوالے کر کے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا سرائے سے کچھ آگے نکل گیا اور
ایک تنگ گلی سے ہوتے ہوئے، اینٹوں سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے
مکان کے پاس رک گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ آنگن میں چاندنی تھی۔ اور سامنے

دالان میں بیٹھے سُروں میں کوئی ستار بجا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اُس کی نظروں کے سامنے رُکمنی اپنے ساز سے نکلتے ہوئے میٹھے سُروں میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی جیسے اُس کی اپنی تنہائی میں ہی اُس کا ساری زندگی کا لطف اور عیش چھپا ہے۔ اس کے حسن سے بھرے مُکھڑے پر جیسے دیپک جلتے ہوئے دیئے کی لَو لرز رہی تھی۔ اس کا مکھڑا شانت تھا۔ وہ اپنے ساز کے تاروں کو اپنے قلب و ذہن کے پورے اطمینان کے ساتھ اپنی مہندی میں رنگی انگلیوں سے اس طرح دھیرے دھیرے چھیڑ رہی تھی کہ ساز سے نکلنے والے سُر بڑے ہی پُر وقار انداز میں سارے ماحول کو شانتی کا دان دے رہے تھے

وہ تک کر رُکمنی کی محویت پر کچھ گم سم سا ہو گیا۔ وہ پلٹ کر چلا جانا چاہتا تھا لیکن ایک ہلکی سی جھنکار کے ساتھ ساز کی آواز رُک گئی۔ رُکمنی نے دھیمے میٹھے سُر جیسے لہجے میں کہا۔

"اندر کیوں نہیں آجاتے راجہ صاحب، بیٹھی ہی تمہارے لیے ہوں۔"

"میں تو آیا ہی تمہارے لیے ہوں۔" راجہ نے جواب دیا۔

"صرف یہ کہنے کے لیے کہ تم آج رات ایک بڑی مہم پر جا رہے ہو۔ آج ندی کنارے تم کو کسی نے بلایا ہے۔" رُکمنی مسکرا پڑی۔

"تمہیں کس نے بتایا۔"

"اُسی نے جس نے تمہیں بلایا ہے۔ بڑی ہی جیوٹ ہے وہ۔ جانتے ہو اُس نے میرے پاس کیا کہلا بھیجا ہے؟ تمہارے آشنا مرد نے مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے آج رات ندی کے کنارے میں نے اُسے ملنے کے لیے بلایا ہے مجھ سے مل لینے کے بعد تمہارا مرد پھر تمہارا ہو سکتا ہے اگر وہ مجھے پسند نہ آئے ورنہ عمر بھر نہیں۔ تم سے بھی میں ایک بار ملوں گی وہ بھی اس لیے کہ بستی بھر میں تم بدنام ہو چکی ہو۔ تمہاری یہی بدنامی تمہاری ذلت کو میرے لیے پرکشش بناتی ہے۔"

یہ سُن کر رُکمنی کا آشنا مرد ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"یہی سب کچھ میں تمہیں بتانے آیا تھا۔ اب مجھے دیر ہو رہی ہے کل تمہیں سب کچھ سمجھاؤں گا۔ چلا جاؤں؟"

"ضرور جاؤ" رُکمنی نے لفظ ضرور پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ چلا گیا تو رُکمنی کچھ دیر چپ بیٹھی رہی اور پھر اپنا ساز اُٹھا لیا۔

جب راجہ اپنے گھوڑے پر سوار ٹہلتا ہوا ندی کے پاس پہنچا۔ وہاں اُسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ سیدھے برگد کے پیڑ کے پاس چلا گیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے پسینے سے شرابور بدن کو سکون پہنچا رہے تھے۔ ندی کے شفاف پانی میں پورن ماشی کے چاند کی کرنیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ رہی تھیں۔ گھوڑے سے اُتر کر وہ پانی پینے کے لیے کنارے کی طرف بڑھا۔ ریت بہت سرد تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ پانی سے پیاس بجھا کر تھوڑی دیر ریت پر لیٹ جائے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ریت بدن کے سارے مساموں کی حدت کو جذب کر لے گی۔ کنارے پر پانی میں تھوڑی دور تک چل کر وہ پانی پینے کے لیے جھک گیا۔ چاند کی لوٹتی ہوئی کرنیں اُس کے ہاتھوں کو چھونے لگیں۔ جب وہ چلّو میں پانی بھر کر اپنے ہونٹوں تک لے آیا تو پیچھے سے بڑی سُریلی سی آواز آئی۔

"تمہاری پیاس یہاں نہیں بجھے گی۔ اِدھر آؤ۔"

راجہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ کنارے سے قریب برگد کے پیڑ تلے ایک اپسرا کھڑی تھی۔ چاندنی جیسے سفید لباس میں لپٹی ہوئی۔ ہلکی ہوا کی لہروں میں اُڑتے ہوئے گیسوؤں میں چمپا کے پھولوں کے نقش نمایاں نمایاں تھے۔ اپسرا کے ہاتھ میں ایک سنہرے رنگ کا تھال تھا اور تھالی میں بھڑکتا لپکتا ہوا ایک شعلہ۔ اور شعلہ ایک نازک سے ہاتھ کی آڑ میں تھرتھرا رہا تھا۔

وہ چپ پانی میں کھڑا اپسرا کو دیکھتا رہا۔ اب پھر بڑے ہی اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ اپسرا کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ اُس کے قریب پہنچا تو اپسرا کا چہرہ

اس لمحے شعلے کی مدھم سی روشنی میں جھلملا گیا — اپسرا کی آنکھوں میں حیرت کی سی چمک تھی۔ وہ چپ رہا۔ اپسرا نے بنا کچھ کہے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھالی سنبھال کر آرتی اتاری۔ اور راجہ کی پیشانی پر تلک لگایا۔ راجہ کو ایک بار نظر بھر کر دیکھا۔ اور مسکرا پڑی۔ پھر اس مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کب سے جانتے ہو مجھے"

"جب سے تم پیدا ہوئی ہو۔" راجہ نے بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے بیاہ کرنا چاہتے ہو؟ اتنا بڑا دھوکہ ہے تمہارا؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ ساری بستی والوں کو خبر کر دیں اور کل صبح ہمارا بیاہ ہو جاتا۔"

راجہ نے اپنا چہرا اس پر جھکاتے ہوئے کہا —

"مجھے ابھی بھی یقین ہے مجھے تو ساری زندگی بتانی ہے تمہارے ساتھ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

یہ بات سن کر راجہ نے قہقہہ لگایا جیسے فتح کا نعرہ لگایا ہو — وہ ایک قدم اپسرا کی طرف اس طرح بڑھا جیسے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ کر پوری طرح مغلوب کر لے گا اور اپنی فتح یابی کی مہر اس کے ہونٹوں پر ثبت کر دے گا۔ اپسرا پیچھے نہیں ہٹی۔ وہیں کھڑے ہوئے اپنی آنکھوں سے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور کہا۔

"جلد بازی سے کام لیتے ہو۔ کوئی ایسا نہ ہو کہ گھڑی بھر میں تمہارا وقار کھو بیٹھو"

راجہ جھجکا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی غیرت جاگی ہوئی سانسوں سے پتہ چلتا تھا کہ اس پر بجلی سی گر پڑی ہے اور وہ اندر کا اندر گھٹ گیا ہے۔ پھر بھی راجہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جو اس اپسرا کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کی آرزو کا اظہار کر رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپسرا کی طرف دیکھا۔ اس بار اپسرا کی آنکھوں میں عجیب سا ڈر تھا

گھوڑے کی لگام تھامے تھوڑی دیر یونہی چلتا رہا۔ پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر جانے کس خ
اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند چمک رہا تھا ستارے روشن تھے۔ رات بھیگی جا
تھی۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ چپ چاپ وہ پھر اپنی رکمنی کے گھر کی طرف ہو لیا۔ رکمنی کے
دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ دبے پاؤں جب وہ آنگن تک پہنچ گیا تو اس نے دیکھا
صحن سے ہو کر دالان کے اندر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے
چاندنی میں اس کے بالوں کی سیاہی چمک رہی تھی۔ اس کا ادھ کھلا چہرہ چاندنی کو زیادہ
نکھار رہا تھا۔ اس کی نیچی گداز باہیں کو چاند بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں
پر ایسی خاموشی تھی کہ دلوں کی دھڑکن صاف سنی جا سکتی تھی۔ راجہ رکمنی کے قریب جا
پہنچا۔ رکمنی نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے ہی سلجھے انداز کے رس میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا
"مجھے یقین تھا تم پھر آؤ گے۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟"

راجہ نے کہا "ہاں" لیکن اس بار اس کی آواز کچھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس
نے وجہ اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کی اور سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہاری جیتی ہوا
ہماری نہیں، اپنی کہو۔"

"ہم تو جیت آئے" راجہ نے کہا اور اس کی اس بات پر رکمنی زور سے ہنس پڑی
لیکن اس ہنسی کا اس کے دل و دماغ کے کسی خیال یا کسی جذبے سے کوئی تعلق نہیں
اس کی ہنسی پر راجہ اس کی طرف بڑھا اور اس کی گداز باہوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے
اور اس نے اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لینا چاہا۔ لیکن وہ تڑپ کر الگ ہو گئی اور کھڑی ہو
گئی۔ اس بار اس کی ہنسی کا اس کے دل کی گہرائیوں سے تعلق تھا۔ اس میں اس کے جذبے
کا رس تھا وہ جوانی کی لذت بھری ہنسی تھی۔ راجہ اس پر جھپٹ پڑا۔ رکمنی نے ادا
کے ساتھ کہا۔ "نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ وہاں کیا ہوا؟"
راجہ نے کہا۔ "ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"دیکھو گے؟"

"ہاں"

"مجھے بتاؤ گے؟"

"نہیں"

"اچھا تو ٹھہرو" کہہ کر اس نے راجہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور گھڑی بھر میں
اپنے سینے پر بندھے کپڑے کو کھول کر پھینک دیا۔

"لو۔ یہی چاہتے ہونا؟" وہ راجہ کے سامنے تن گئی۔

"ابتو۔ کچھ پوچھ بیٹھ پڑو۔"

راجہ یکلخت ساکت ہوگیا۔ چپ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ گئی۔ اس نے
بڑے ہی بوجھل لہجے میں کہا "اچھا" اور نظریں جھکا لیں۔

رکمنی نے راجہ کی آنکھوں میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں
سے اپنا سینہ ڈھانک لیا اور کہا۔

"ادھر دیکھو۔" کہتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔

راجہ نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اس کے سینے کو ڈھانکنے والے ہاتھوں
کو دیکھا اور کہا۔

"اب تمہاری وجہ سے ہوتا ہے۔"

رکمنی نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ اور راجہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ راجہ کی گرم
گرم سانسوں نے اس کے ہونٹوں کی تپش نے ساری چاندنی میں آگ لگا دی۔ چاندنی
میں سرخیاں پھیلنے لگیں۔ چاندنی شعلوں کی طرح تپنے لگی۔ فضا میں چنگاریاں اڑنے
لگیں فضا میں چنگاریاں اڑتی رہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں ہی چنگاریاں راکھ بن کر
اڑنے لگیں۔ چاندنی میں پھیلی ہوئی سرخیاں چھٹنے لگیں۔ چاندنی میں پھیلی ہوئی آگ

چھپنے لگا۔ پھر چاندنی دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوگئی۔

راجہ پیدل تھکے ہوئے گھوڑے کی لگام تھامے اپنا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن اُس کو اس رات کی خاموشی میں بار بار ایک ایسی موسیقی سنائی دینے لگی جو اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔

اس بات پر غور کیا ہوگا کہ آخر یہ سندر دیش کا شہزادہ کہاں سے آگیا اور ادھر کیسے آگیا
آخر یہ کون ہے۔ اس کے لوگ کہاں ہیں۔ کیا سچ مچ ان کو ہمارا گاؤں اور ہم گاؤں
والے اتنے اچھے لگے۔ اتنے بھا گئے کہ اپنی کرپا کی دان دے دی۔ جیسے اس من موہنے
راج دلارے کسی داتا کے روپ میں؟ وہ سچ مچ سویہ دیوتا کا روپ تھا۔ اس کے چہرے
سے سارا گاؤں روشن لگتا تھا۔ ایک دن ایک بوڑھے نے اس سے پوچھا:

"اتنا پیارا گھر ہے، بسا کیوں نہیں لیتے؟"

"گھر بسا لوں؟ گھر تو بسا بسایا ہے۔ یہ بتاؤ اس گاؤں میں کون گھر میرا نہیں ہے؟"

"سچ ہے تو۔ مگر اس گھر میں بھی تو ایک گھر والی آجائے؟"

"گھر والی؟ آئے گی، ضرور آئے گی" یہ کہتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔
اس کے سرخ سرخ جوان گالوں پر ہلکی سی چھوٹ پڑی تھی۔

—٭—

(۴)

موتیا اور نرگس کی ادھ کھلی کلیوں کی سی جوکھی سفیدیاں، شبنم میں بھیگی رات کے
چہرے سے پھوٹنے لگی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہواؤں میں خوشی کے آنسوؤں جیسی نمی کا احساس
ہوتا تھا۔ سارے شجر حجر جو رات بھر برسات کی بدمستیوں کے بارے میں سرگوشیاں کرتے
رہے تھے اب اپنی اپنی جگہ خاموش تھے اور رات کے کتنے ہی رازوں کو اپنے سینوں میں
چھپائے ہوئے تھے، بالکل چپ، ایک دوسرے سے نظریں پھیرے ہوئے،
مودب کھڑے ہوئے تھے کہ شاہِ خاور کی آمد کی نوید مل چکی تھی۔

ایسے میں وہ ہشاش بشاش خوبرو وجیہ و شکیل نوجوان شبنم میں بھیگے سبزہ زاروں
پر بڑے ہی سکون و وقار کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اپنے نقشِ قدم کے
ساتھ ساتھ ماحول پر اپنی ذی شان شخصیت کا اثر بھی چھوڑتا جاتا تھا۔ ایک سرسبز
وادی کے پُربہار رنگ برنگے مناظر اپنی بوقلمونی پر نازاں ہونے کے باوجود اُس کی
طرف نگراں تھے۔ ایک ادھ کھلی کلی کی طرح مسکراتی صبح، اپنی سنہری تراوٹوں میں نہلاتے
ہوئے تجلی سی تھی اور شفق سے پھوٹنے والی شوخ و شنگ سرخیاں اُس
کے بدن کی رعنائیوں کو دوبالا کئے دیتی تھیں۔ نوجوان نے اُس کنواری صبح کی عریاں
لطافتوں کا لمس اپنے روم روم میں محسوس کیا اور نرم و نازک پھولوں کی طرح
کھل کر مہکنے والے جذبات نے اُس کے بدن میں ایک انوکھی خواہش کی ہلکی آنچ روشن
کر دی۔

انسان اگر واقعی انسان بن جائے تو اُس کے ہر جذبے میں کتنا اعتبار، کتنی تمکنت
اور کتنا تلذذ آجاتا ہے۔ زندگی کی سرشاری شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اُس حسین وادی
کے سارے مناظر بڑے ہی والہانہ انداز میں جلوہ گر تھے لیکن اُس انسان سے مرعوب
تھے۔ اُفق سے ابھی پہلی کرن بھی پھوٹی نہیں تھی لیکن اُس نوجوان کی نظروں نے

وادی کے ہر حصّے کو ایک دلکشی بخش دی تھی۔

جھرنے گیت گاتے ہیں، وہ جانتا تھا، اُس نے سوچا "چلو گیت سُنیں"

وہ جھرنے کی طرف بڑھ گیا۔

جیسے اچانک سورج کی ایک کرن ٹوٹ کر جھرنے کے پانی میں جھلملا گئی۔ جیسے یا
اُس نوجوان کی نظر جگمگاتی شے سے ٹکرا گئی ہو۔ یا جھرنے کا گیت روشنی میں ڈھل گیا ہو
بس اُس ایک بہت ہی مختصر سے لمحے میں اُس نے جو کچھ دیکھا، دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ
گیا۔ لیکن اُس کے پیروں تلے کھڑکنے والے سوکھے پتوں نے اچانک جیسے سارے
ماحول کو خبردار کر دیا ہو۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں ایک بہت ہی اونچا پورا اگنا پیڑ تھا
اس کی موٹی موٹی جڑوں سے پانی جھر رہا تھا، یہی پانی کچھ آگے بڑھ کر ایک چھوٹی
سی چٹان سے ہوتا ہوا نیچے گرتا تھا۔ ٹھیک اُس جگہ پہونچ کر اُس کی نظریں چکاچوند
ہو گئی تھیں۔ وہ سنہری شے، اُسی جگہ ایک نوجوان، گداز اور دہکتے بدن کی شکل لیا
عریاں ہو گئی تھی اور اُس کے گیلے بدن پر پھیلی ہوئی، پانی کی بوندیں سہم کر حیران ہو گئی تھیں
پلک جھپکتے میں جھرنے کا گیت مدھم پڑ گیا تھا اور اُس نے محسوس کیا تھا جیسے اب اچانک وہ
اونچا پیڑ بول پڑے۔

"تم نے ہماری دیوی کا اپمان کیا ہے۔ اب عمر بھر کے لیے تم اندھے ہو جاؤ گے"

نوجوان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن [illegible] محسوس ہوتا رہا کہ اُس کی نظروں کی
ٹوٹی ہوئی کرنیں اُس ایک مقام کا طواف کر رہی ہیں۔ وہ کچھ اور پیچھے ہٹ جانا چاہتا تھا
لیکن اُس کے پیر پتھر کی طرح وزنی ہو گئے تھے وہ وہیں اُس پیڑ کی آڑ میں کھڑا رہا۔
چپ چاپ اپنے آپ کو پیڑ کے پیچھے چھپائے ہوئے اور زندگی میں پہلی بار ایسا محسوس کرتے
ہوئے جیسے اُس کے چوڑے چکلے سینے میں کوئی ایسی چیز چھپی ہوئی ہے جو چاروں
طرف سُنائی دینے والا ایک شور بن گئی ہے۔ ایک شدید اور کب [illegible] اُٹھی اُس

کے سینے میں ابھری کہ وہ گھبرائی ہوئی آنکھیں کھول کر اُس طرف دیکھنے لگی اُس کی پلکیں ایک
خوف کے بوجھ سے جھپکی ہوئی تھیں۔ وہ شخص بھی کتنا انوکھا تھا اُس کی سمجھ میں نہیں
آیا کہ خوف بھی اتنا لذیذ اور نشہ آور ہوتا ہے، ایک معصوم بدن کی ساری قوتوں کو
زیر کر دیتا ہے لیکن ایسے میں ان قوتوں کو سمیٹنا کیا عجیب کارنامہ ہوتا ہے۔ اُس نے پیچھے
اپنے آپ سے پوچھتے ہوئے اپنی آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور پیڑ کے پیچھے سے جھرنے
کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک جنگل کے ہر گوشے سے آواز آنے لگی ہو
"چور، چور، چور"۔ وہ چاہتا تھا پھر سے آنکھیں بند کر لے لیکن پل بھر میں وہ اپنے
آپ کو بالکل تنہا سمجھا۔ دیوی جھرنے سے کچھ پرے ہٹ آئی تھی اور اس نے اپنے
نور برساتے چہرے کے تقدس کا ایک ریشمی سا لباس اپنے روشن روشن بدن پر اوڑھ
لیا تھا۔ اب وہ بڑے ہی سنبھلے سنبھلے قدموں سے، رنگ برنگے پھولوں کے ایک
جھنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے بھیگے ہوئے سنہرے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک
رہے تھے، جو اس کی راہ میں پڑے ہوئے تشنہ لب سوکھے پتوں کی پیاس بجھا رہے تھے
دیوی جھنڈ کے قریب جا کر رک گئی۔ وہاں پتھر کی ایک مورتی تھی۔ دیوی اپنے گیلے بدن کو
سنبھالے ہوئے مورتی کے سامنے بیٹھ گئی۔ مورتی کے سامنے ایک دیا جلایا اور اپنی آنکھیں بند
کیے، بڑے ہی انہماک کے ساتھ اپنے بھگوان کے گیان میں کھو گئی۔

دیوی کو اس کیفیت میں دیکھ کر پتہ نہیں اُس کا سارا خوف کہاں غائب ہو گیا۔ اُسے محسوس
ہوا کہ اُس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی ہیں۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے اور اُس کے اونچے
پورے بدن میں بلا کی قوت ہے۔ وہ دیر تک پیڑ کے پیچھے کھڑا رہا، یہ سوچ کر کہ دیوی کے گیان
میں خلل نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب دیوی بھگوان کی مورتی کے سامنے سے اٹھ کر ایک طرف
دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تو بنا کچھ سوچے سمجھے، بلا کسی خوف کے وہ پیڑ کے پیچھے سے
نکل آیا اور دیوی کی طرف بڑھنے لگا، دبے پاؤں کہ کہیں سوکھے پتے بولنے نہ لگ جائیں۔

نے بڑے ہی گمبھیر سے لہجے میں کہا — "دیوی جی! اس وقت میں بھگوان کے سامنے کھڑا ہوں، بھگوان مجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر اس وقت میرے جی میں ذرا سا بھی کھوٹ ہوگا تو بھگوان سے میری پرارتھنا ہے کہ وہ مجھے یہیں بھسم کر دے!

دیوی نے پلٹ کر بس ایک نظر مرد کی طرف دیکھا۔ مرد نے بڑے ہی آدر کے ساتھ کہا۔
"مجھے یقین ہے آپ بھگوان کا ایک روپ ہیں، بہت ہی سندر روپ، میرے جی میں یہی آیا کہ آپ کے سامنے اپنا سر جھکا دوں۔"

"نہیں، نہیں — ایسا نہ کہیے —" بڑی ہی گھبرائی ہوئی آواز میں یہ کہتے ہوئے دیوی مرد کی طرف بڑھی — "میں..... میں..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"آپ کا روپ بتاتا ہے کہ آپ کتنی مہان ہیں۔ اسی لیے تو میں بڑے آدر سے سر جھکا رہا ہوں۔"

دیوی پھر چونک پڑی — بڑی ہی سہمی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھا اور گھبرائے ہوئے انداز میں وہ دو قدم مرد کی طرف بڑھ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"نہیں، نہیں — بھگوان کے لیے ایسا نہ کہیے — یہ پاپ ہے — یہ پاپ ہے — اور اور... میں پاپ سے بہت ڈرتی ہوں۔ آپ مجھے شما کر دیجیے۔ میں جا رہی ہوں۔"

"آپ ضرور چلی جائیے — لیکن بھروسہ کیجیے میں برا آدمی نہیں ہوں۔ صرف اتنا بتا دیجیے کہ میں بھگوان کے روپ کے سامنے سر جھکا دیا تو وہ پاپ کیسے ہو گیا۔"

دیوی نے پھر چاروں طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ پاپ ہے — آپ نہیں جانتے۔"

"اگر میں نہیں جانتا تو آپ بتا دیجیے۔"

"نہیں — مجھے دیر ہو رہی ہے۔ شما کر دیجیے۔"

"میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ لیکن آپ سے بنتی تو کر سکتا ہوں۔"

اس بات پر دیوی نے بے ساختہ اپنے ہاتھ سے مرد کو اشارہ کر دیا کہ وہ ایسی بات

نہ تھکے۔ اور کہا ۔۔ "ایسا نہ کہئے یہ سچ مچ پاپ ہے۔"

"پاپ؟"

"ہاں پاپ"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"آپ کون ہیں؟"

"میں؟ ۔۔ یہ جان کر آپ کو فائدہ نہیں ۔ مجھے جانے دیجئے۔"

مرد نے اس بار کچھ پریشان ہو کر دیوی کی طرف دیکھا۔ دیوی کے چہرے کے اطراف سرخیوں کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتی جیسے دو آنسو تھے۔ مرد نے اپنی آنکھیں جھکا لیں ۔ اور کہا ۔

"چلی جائیے ۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے ۔ مجھے معاف کر دیجئے" اس کا سر دیوی کے سامنے خم ہو گیا۔ دیوی کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے موتی ٹپک پڑے ۔ اس کو اس وقت اپنے پیروں میں اتنی بھی قوت محسوس نہیں ہوئی کہ اپنی جگہ سے وہ آگے یا پیچھے ہٹ سکے ۔ لیکن جب اس نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے ایک قوی ہیکل نوجوان کو سر خم کیے کھڑا دیکھا تو اچانک اسے کچھ خیال آ گیا ۔ اس خیال کے آتے ہی جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی ہے اور پہلی بار اس کے ہوش درست ہوتے ہیں ۔ اس نے بڑی ہی صاف آواز میں کہا ۔

"دیکھئے ۔۔ بات ... میں دراصل ایک ویشیا کی لڑکی ہوں۔" اور سر جھکا لیا ۔

"ویشیا کی لڑکی؟" مرد نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا ۔

"ہاں" دیوی نے اس بار بڑے ہی پر اعتماد لہجے میں کہا "میری ماں ایک ویشیا ہے ۔ میری ماں کی ماں بھی ویشیا تھی ۔۔ لیکن میں ۔۔ میں پاپ سے ڈرتی ہوں ۔۔ میں ۔۔ میں

چندری سے اِدھر دیکھ رہے ہیں ۔ ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں سے چھوٹنے والی شعاعیں کتنی شوخ ہیں ۔ میرے تو سارے بدن میں گدگدی سی ہو رہی ہے ۔ اور یہ جھرنے کا گلال جیسا پانی، جس سے آپ نہا کر نکلی ہیں، ابھی تک اپنی مستیوں میں لہرا لہرا کر جانے کونسا گیت گا رہا ہے کہ جنگل کے سارے پھول پات، پیڑ، پنچھی اُس کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں ۔ سارا جنگل گنگنا رہا ہے ۔ ایسی شبھ گھڑی زندگی میں کسے نصیب ہوتی ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرے اندر بھی پوتر جل کا ایک جھرنا پھوٹ پڑا ہے جس میں میرا من اشنان کر رہا ہے ۔ میں شاید اب اپنے آپ کو روک نہیں سکتا ۔ میں بھگوان کے سامنے پرارتھنا کرنے جا رہا ہوں کہ ـــــ "ہے بھگوان تو اس دیوی کے من کی مراد ابھی پوری کر دے ۔ ان کا ساتھی انھیں ابھی ملا دے"

"ابھی!!" دیوی کی زبان سے خود بخود نکل پڑا ۔

"ہاں" یہ میرے دل کی ان گہرائیوں سے نکلی ہوئی بات ہے جہاں بھگوان کا استھان ہوتا ہے ۔ اس لیے مجھے یہ گیان ہو گیا ہے کہ میری پرارتھنا سپھل ہو گی ۔"

یہ کہتے ہوئے مردنے آگے بڑھ کر بھگوان کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں ۔

اُس وقت دیوی بے حد بے چین سی ہو گئی ۔ بڑی ہی ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا ـــ اُس نے سوچا کہ آج چلنے کے لیے اُس کے پیر کیوں نہیں اُٹھتے ؟

مرد نے آنکھیں کھول دیں اور بھگوان کی مورتی ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "دیوی جی ۔ میں نے جب آنکھیں بند کیں تو مجھے ایک روشنی سی نظر آئی ۔ میں نے صاف دیکھا بھگوان مسکرا رہے ہیں ۔ ایسے میں میں نے بھگوان سے اپنے دل کی بات کہہ دی "میرے پربھو بس میرے من کی یہ ایک اِچھا پوری کر دو کہ میں جیون بھر اِس دیوی کی پوجا کرتا رہوں ۔"

"اُف ـــ نہیں ـــ" دیوی کے حلق سے جیسے ایک دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔ مرد نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا ـــ "آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی دیوی جی ؟"

"ہاں" دیوی نے کہا۔

"پتہ نہیں کیوں آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ بھگوان نے تو یہ بات مان لی۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے ـــ میں، میں ـــ مجھے معاف کیجئے ـــ میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا دیوی جی چلی جائیے۔ مگر جانے سے پہلے میری ایک اور بات سن لیجئے ـــ بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں جیون بھر پھر ادھر نہیں آؤں گا۔ آپ سچ مچ بھگوان کا ایک روپ ہیں۔ میری اتنی سی بنتی ہے، اجازت دیجئے کہ ایک بار آپ کے چرن چھو لوں۔"

"نہیں، نہیں" تقریباً چیختے ہوئے دیوی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

مرد آنکھیں جھکائے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــ اس بار دیوی نے ایک بھرپور نظر مرد پہ ڈالی۔ اونچا پورا قد۔ چوڑے مضبوط شانے، شاداب چہرے پہ نوجوانی کا ولولہ، جھکی نظروں میں انسانیت کا پُر تقدس نور جس کے ہالے میں جیون کو شرن مل جائے۔ دیوی نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر اس طرح باندھ لیے جیسے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالا دے رہی ہو ـــ اپنی بھاری بھاری سانسوں میں اس نے پوچھا ـــ "آپ کون ہیں۔"

"آپ کا پجاری۔"

"یہ آپ کیوں کہہ رہے ہیں۔"

"یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، یہ بھگوان کی مرضی ہے۔"

"لیکن..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اپنے آپ سے تنگ آ کر کہا ـــ "آپ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے ؟"

"میں آپ کو روک نہیں سکتا دیوی جی ـــ آپ چلی جائیے ـــ میں صرف اپنے

۵

گاؤں کی ہر گلی میں ایک شور تھا۔ چیخیں تھیں، قہقہے تھے۔ گاؤں کے اطراف
پھیلے ہوئے میدان اور جنگل جیسے سکڑ گئے تھے۔ پھول پات جل چکے تھے اور
سارے درندے گاؤں کی گلی گلی میں دندنا رہے تھے۔ درندوں کا ایک ہجوم
ہر گلی سے ہوکر اس گھر کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں دیوی بند تھی۔

دیوی کے گھر کی دیواریں کانپ رہی تھیں کہ اب ان پر پتھراؤ ہونے والا تھا۔
ان کی نچلی دیواروں کو پھاند کر اس گھر کا مرد اس پہاڑی کی دوسری طرف اتر گیا تھا جہاں
سے وہ پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا۔ اب اس پہاڑی کا قد گھٹ گیا تھا اور لگتا
تھا جیسے سارا گاؤں بے آسرا ہو گیا ہے۔

جب درندوں کا ہجوم چیختا چنگھاڑتا اس دیوی کے گھر کے قریب پہونچا تو اس
وقت اس گھر کے ایک کمرے میں دیوی بند تھی اور شدید درد و کرب میں مبتلا تھی۔
اس کی چیخیں خود اس کمرے کی دیواریں بھی سن نہ سکتی تھیں۔ جب درندے اس گھر
کے دروازے پر پہونچ کر اپنے خونخوار دانت نکوسنے لگے تو دیوی کی ماں اپنے
سنہرے بال بکھرائے، اپنی آنکھوں میں ایک وحشت ناک کامیابی کی چمک لیے اور
زمانے بھر کی بے حیائی کا اپنی مسکراہٹ سے اظہار کرتے ہوئے دروازہ کھول کر
ہجوم کے سامنے اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے کوئی سپہ سالار اپنی فوج کو حکم سنانے والا
ہو، فتح و نصرت کا اعلان کرنے والا ہو۔

اپنی گردن کو ایک جھٹکا دے کر اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ایک طرف
اچھال دیا اور کہا۔

"میرے سامنے کھڑے ہو تمہاری جیت ہوئی ہے"

تو درندوں نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔ ہم نہیں مانتے۔ اس کو ہمارے حوالے کرو۔ وہ ہم سب کا مجرم ہے"

دلیوی کی ماں نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود دُم دبا کر بھاگ گیا ہے۔ اب وہ اس جنم میں کبھی ادھر نہیں آئے گا۔ میں آپ سب کو بدھائی دیتی ہوں اور پرارتھنا کرتی ہوں کہ اب آپ سب اپنے اپنے گھر کو چلے جائیے۔ آج آپ کے گاؤں کی اس وشیا کا گھر پاک ہو گیا ہے۔" اس نے پھر اپنی گردن کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اس کے سنہرے بال پھر اس کے شانوں پہ بکھر گئے۔ اچانک سارے مجمع پہ ایک سکوت طاری ہو گیا۔ پھر کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں اور سارے درندے دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ جیسے سب مل کر اچانک اس گھر پہ ہلّہ بولنے والے ہیں کچھ عجیب ہولناک خاموشی تھی۔ سارے درندے دلیوی کی ماں کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دلیوی کی ماں نے اچانک اپنا ہاتھ اوپر کو اُٹھایا اور چیخ پڑی۔

"میرا بھی کوئی بھگوان ہے۔ اور میں اس کی سوگند کھا کر کہتی ہوں آپ سب جس کی تلاش میں ہیں وہ ہم سے بچ کر فرار ہو گیا ہے۔ اگر مجھ پہ وشواس نہیں ہے تو آپ میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر سارے گھر کی تلاشی لے سکتا ہے۔ اگر وہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو یہ دونوں ہاتھ اس کے خون میں رنگے ہوتے۔ وہ بزدل تھا۔ ڈر کر بھاگ گیا۔ میں آپ سب کو دھنیہ واد دیتی ہوں۔ آپ سب نے میرا ساتھ دیا۔ آپ سب کا جیتے ہو"

اس نے سارے مجمع کے سامنے جھکے ہی انکسار سے ساتھ ہاتھ جوڑ دیئے درندے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگے۔ مجمع چھٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب اپنی اپنی گپھاؤں میں لوٹ گئے۔ اب اس کے سامنے کوئی نہیں تھا۔

سُن لی تھی اور سچے دل اور سچے ایمان سے مانگی ہوئی دیوی کی دعا بھگوان نے قبول کر لی تھی اور دیوی کے پاس ایک ایسے انسان کو بھیج دیا تھا جسے دیکھ کر یہی خیال ہوتا تھا کہ شاید بھگوان اپنے پاس ایسے انسان بنا کے رکھتا ہے جو انسانیت کے سچے نمائندے ہیں کہ ایسے درندوں کے بیچ آجاتے تھے جن کی بھلائی کے لیے کسی انسان کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن ہمیشہ کی طرح اس جنگل کے درندوں نے اپنے بھگوان کی مرضی کا خون کر دیا تھا۔ اس انسان کو پہاڑی کی چوٹی تک لے جا کر دوسری طرف کھائی میں پھینک دیا تھا اور اس کے گھر میں ہر طرف خون ہی خون بہا دیا تھا۔

جس منی جان نے ایسے وقت جنم لیا تھا اس کے رونے کی آواز اب دب چکی تھی۔ اس کے قریب پڑی ہوئی اس کی ماں کا دم ٹوٹ چکا تھا اور اس کے گھر کے باہر دروازے کے قریب اس کی ماں کی ماں اپنے سر سے بہتے ہوئے خون میں لت پت فرش پہ بے ہوش پڑی جان دے گئی تھی۔

~

۶

آج ایسا لگتا ہے کہ اُس ننھی سی نوزائیدہ بچی نے ہمت کر کے خود ہی جینا شروع کر دیا تھا۔ وہ شاید خود ہی اُٹھ بیٹھی ہو اور پھر ہو سکتا ہے خود ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ہو۔ پھر چلنے لگی ہو، دوڑنے لگی ہو، اور اپنے اس جینے کی کوشش میں ساری بستی اور بستی والوں کو خوب جان گئی ہو۔ اُس نے اپنے آپ کو اپنے لمبے چوڑے گھر کی پختہ دیواروں کے اندر محفوظ کر لیا تھا۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے بالکل بے خوف ہو جائے تو وہ انسان یقیناً ایک ایسی زندگی گزار سکتا ہے جس میں صرف اُس کی اپنی مرضی کا دخل ہو۔ ایسے انسان کے سامنے تو شاید ایک عظیم ہستی بھی چنگھاڑ کر سرنگوں ہو جائے اور پوچھے — "کیا میں یہاں سے گزر سکتا ہوں؟" یہی تو ہوا تھا، اس جنگل کے سارے درندوں نے دھیرے دھیرے اُس کے سامنے اپنے سر خم کر لیے تھے۔ کسی کے پاس اتنا بڑا کلیجہ نہیں تھا کہ اُس گھر کی طرف بُری تو بُری، اچھی نظر بھی اُٹھا کر دیکھ سکے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ اپنے سہارے آپ آگے بڑھنے والی بچی نہیں تھی۔ بلکہ اب وہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو ایک جہانِ ستم ایجاد کا مقابلہ کرنے کے لیے زرہ بکتر سے لیس کر لیا تھا۔ خود داری اور خود سری کا خود پہن لیا تھا اور اپنی پلکوں کی شعاعوں کو زہر میں بجھا لیا تھا۔

دنیا کا سب سے بڑا طلسم شاید عورت کو کہا جا سکتی ہے بشرطیکہ اُس کے حُسن و شباب کا ہر زاویہ مغرورہ تکبر لیے ہوئے ہو۔

کہتے ہیں کہ جوانی جیسی خود سر عمر نے وشالی کا بڑے ہی تزک و احتشام [illegible]

استقبال کیا تھا۔ اُس کے بدن کے ایک ایک عضو پہ دار سے نیا [illegible]

کی شدت سے پابند تھی۔

ایک سال جب کہ گھر پہ چھائی ہوئی رنگ برنگی بیلوں میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹیں اور ہر طرف پھول ہی پھول کھل گئے اور سرد ہوا کے جھونکوں نے اُس گھر کے ہر گوشے میں پھول ہی پھول بکھیر دئیے تو وشالی کو اپنے بدن کے ہر رُوم سے اور اپنی ہر سانس سے تازہ پھولوں کی مہک آنے لگی۔ اُس کی سانسوں کی مہک کو ہوائیں لے اُڑیں۔ اور پھر وہی مہک سارے نگر میں پھیل گئی۔ لیکن جلد ہی یہ مشہور ہو گیا کہ یہ مہک تو اُن پھولوں کی ہے جنہیں وشالی رہا کرتی ہے۔ پھر بھی بہت سے کڑیل نوجوان تنے ہوئے سینوں پہ تلواریں لٹکائے یا کمانیں کندھوں پہ باندھے یا ہاتھوں میں نیزے سنبھالے اِدھر آ نکلے۔ لیکن اُس گھر کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے اُن کے پیروں تلے زمین اندر دھنسنے لگتی اور اُن کے قدم ڈگمگا جاتے۔ آخر ایک جانباز نے یہ سوچا کہ حسن جتنا مغرور و خود سر ہوتا ہے اتنا ہی عشق کی سرفروشی کی قدر کرتا ہے۔

اگر وہ سچے جذبے سے اپنی جان پر کھیل جائے تو دنیا میں شاید ہی کوئی صورت ایسی ہو جو نہ جیتی جا سکے۔ اس جانباز نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ "یا تو میں اس دہلیز پر قتل کر دیا جاؤں گا یا پھر سدا بہار پھولوں کی مہک سے اپنی زندگی بھر کی سانسوں کو بسا لوں گا۔"

سرِ شام اُس نے وشالی کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ لگتا تھا کہ سینے سے کوئی جوالا مکھی پھوٹ رہا تھا۔ دروازے پہ اُس نے جو دستک دی تو اُس دستک میں خود اعتمادی کی صدا تھی اور شاید اسی صدا سے کواڑ کھل گیا۔

جب حسنِ جوان سال کا سامنا ہوا تو جانباز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اندر سے آواز آئی ——— "کون ہو تم"؟

پہلے تو کچھ دیر کوئی جواب سنائی نہیں دیا۔ پھر بہ مشکل جانباز نے کہا۔

"میں بھول گیا ہوں کہ میں کون ہوں۔"

"کیوں آئے ہو؟"

"مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ شاید میں اس ارمان کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ اس دہلیز پر کبھی اپنی جان دے دوں گا۔"

"تم اندر آ سکتے ہو۔"

جانباز نے کوئی حرکت ہی کی نہ کوئی جواب دیا۔ پھر آواز آئی۔

"اندر آ جاؤ۔"

جانباز نے کہا "مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ صرف ایک روشنی سی ہے جس کی وجہ سے شاید ہر طرف اندھیرا چھایا نظر آ رہا ہے۔"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں — میں تو شاید واپس اپنی زندگی کی طرف جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"تم جا سکتے ہو۔" دروازہ بند ہو گیا۔

اس واقعہ کے تین دن بعد یہ خبر مشہور ہو گئی کہ اس جانباز نے اس گھر کے سامنے والی سربلند پہاڑی سے کود کر اپنی جان دے دی۔

ے

ہر روز صبح ، سورج کی کرنوں کی سرخیوں میں ، اُس سربلند پہاڑی کے ڈھلوانوں
پر سے بھیڑوں کے کتنے ہی گلے نیچے اُترتے ہوئے نظر آتے تھے اور اُن کے ساتھ
ہوتے تھے نوعمر گلّہ بان ۔ کمبل اوڑھے ہوئے ۔ شانوں پر پتلی پتلی چھڑیاں تولے
ہوئے ۔ پہاڑی کے ڈھلوانوں پر کلیلیں کرتے ہوئے ۔ چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے
صبح کے سنہرے سکوت میں سریلے قہقہے بکھیرتے ہوئے ۔ بانسری کی ادھوری ،
ادھوری تانیں اڑاتے ہوئے ۔ اپنے کچے پکے بدن پر پہاڑی کی سرخ مٹی کی مدھم
مدھم سرخی لیے ہوئے ۔ اور آنکھوں میں اپنی عمر کی شعاعیں پھیلاتے ہوئے ۔
گالوں پر عنبریں رُواں ، ہونٹوں کے روئیں پر شبنم کی نمی ، باتوں میں کچے
دودھ کی مٹھاس اور چہروں پر اپنی اس مٹھاس اور مہک سے بے خبری ۔
کس تیزی سے وہ ڈھلوانوں سے اتر کر نیچے پھیلی ہوئی سرسبز وادی میں
تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے اور پھر بستی کے قریب کے میدان میں جو نمودار ہوتے
تو ایسا ہی معلوم ہوتا جیسے صبح کی پاکیزگیوں میں نہائے ہوئے زندگی کی معصومیت
کے پیامبر آ گئے ہیں ۔

یہ بستی والوں تک تازہ دودھ پہنچایا کرتے تھے ۔ بستی والوں سے مل کر خوب
ہنستے تھے ۔ بستی میں کھیلتے تھے ۔ بنا یہ جانے ہوئے کہ اس طرح روز وہ اپنی پُرتقدس
معصومیت سے بستی کی زندگی کو پاکیزگی بخشتے ہیں ۔ صبح کی کرنوں میں ان کا
وجود کچھ ایسا ہی منظر بن جاتا تھا اور اسی منظر کے ساتھ ساری بستی جاگ اٹھتی تھی ۔
تازہ رو ہو کر تازہ دم ہو کر ۔

وشالی کے گھر میں بھی روز صبح ایک ایسا ہی معصوم فرشتہ اترتا تھا۔ روشنی کا
پیغامبر اُترتا تھا۔

صبح کی سنہری دھوپ میں اُسکے سنہرے بال اسکی ہلکی سرخ پیشانی پہ اس طرح بکھرے ہوتے تھے کہ لگتا تھا کہ اگر وہ سنہرے بال اس طرح بکھرے نہ رہیں تو سورج کی کرنوں کا سونا چوری ہو جائے۔ اُسکے گالوں کی سُرخی کے نیچے ہلکی ہلکی سی سختی آنے لگی تھی۔ اُس کی ننھی ننھی آنکھوں کی اجلی چمک پہ ایک نئی چمک کی دھیمی سی تہہ نظر آنے لگی تھی جس کے باعث چہرے کی معصومیت پہ ایک نئے جذبہ کا احساس ایک رنگ بن رہا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ بار بار شوخ اشارے کرنے لگی تھی کہ دیکھو اس چہرے کو — میں جھانک رہی ہوں۔

اُس کی عمر سے زیادہ اُس کا قد نکل آیا تھا۔ اُسکے سینے اور اُسکے بازوؤں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کم سن کم ہے اور جوان زیادہ — یا پھر ابھی ابھی کم سنی نے اُس کا دامن چھوڑا ہے لیکن اسکی لمبی لمبی ٹانگیں بہت مضبوط تھیں جن کو دیکھنے سے یہ خیال آسکتا تھا کہ اسکو زندگی میں اب کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

ہلکا پھلکا ڈھیلا ڈھالا لباس، کہیں پھٹا ہوا، کہیں سلا ہوا، بکھری بکھری سی کمبل، ہاتھوں میں چھڑی اور دودھ کی مٹکی — آنکھوں اور ہونٹوں پہ ایسی شوخ مسکراہٹ کہ پھسلتی جائے تو پہاڑ کے ڈھلوانوں تک بنا روک ٹوک روشنی سی پھیل جائے۔

یہ مسکراہٹ پہلی شے تھی جسے وشالی نے اپنے کسی اندرونی جذبہ سے مجبور ہو کر قبول کیا تھا۔ یہ زندگی کا پہلا تحفہ تھا جسے قبول کرتے ہوئے وشالی کی حسین جوانی بنا کسی حجاب کے ہنس پڑی تھی۔ اُس لمحے اُسے یہ معلوم ہوا تھا کہ زندگی بھی حسین ہوتی ہے۔

وہ مسکراتا فرشتہ سورج کی کرنوں کی طرح آجاتا اور نسیم سحر کی طرح گزر جاتا اور
وشالی کے وجود کے اطراف ایک روشنی اور مہک چھوڑ جاتا، اور لیچی کے تازہ دودھ
کی سگندھ اسکی سانسوں میں مستیوں کا احساس پیدا کر دیتی۔ اچانک اسے ایک بار
دل کی دھڑکن سنائی دیتی۔ پھر اسکے بدن کے ہر ریشے میں ہڑک سی لذید اور بجلی کی
سی چھوٹنے لگتی جو چہرے پر اس طرح نمودار ہو جاتی جیسے معلوم ہو کہ شرم و حیا کی
سرخ پھلیوں سے رسنے والی سنگل پھوار ہوتی ہے۔ جب اس کا سارا بدن اس
پھوار سے تر ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اسکے بدن کا ذرہ ذرہ مشک و عنبر میں بھیگا
ہوا ہے۔

یہی وہ دن تھے جب کہ زندگی کی دلفریبیوں نے چپکے چپکے پہلی بار وشالی کی
زندگی میں قدم رکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے زندگی کی طرف کبھی بھی نظر بھر کر
دیکھتے ہوئے اپنے وجود کے حسن کا احساس نہیں کیا۔ اس نے اپنے آپ پر ایک
بھرپور نظر ڈالی تو اس طرح اپنی پلکیں جھپکائیں جیسے اپنے آپ کا نظر اتارتی ہو۔

پھر ایسا ہوا کہ سورج کی وہ کرنیں جو اس مسکراتے فرشتے کے ساتھ آیا کرتی
تھیں اب اس گھر کے صحن میں ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھیں۔ وہ جھونکے جو نسیم سحر میں
گزر رہے تھے، اب وہ اس صحن میں آکر تھمنے لگتے تھے۔ پھر ان جھونکوں
کے ساتھ اس صحن میں پھولوں کے ڈھیر لگنے لگے تھے اور اس مسکراتے فرشتے کے
چہرے پر جو مستیاں جھلکتی تھیں، ان میں انہی پھولوں کی خوشبو لپٹنے لگی تھی۔
اب اسکے چہرے کا ہالہ دراصل سورج کی ڈوبتی کرنوں کا گھیرا معلوم ہونے لگا تھا
اور اسکی آنکھوں کی چمکدار نیلی جھیلوں سے زمین تا فلک ساری وسعتیں منعکس ہونے
لگی تھیں اور پھر ان جذبات میں وشالی کے رخ روشن سے چھوٹنے والا گلال آہستہ
آہستہ اس طرح گھلنے لگا تھا کہ وہاں انسانی ذہن و بدن ایک ملکوتی تصویر بن گئے

اور ساری فضا ایک تصوراتی فردوس میں ڈھل جاتی ۔ رنگ، روشنی، ٹھنڈک، جنون، نظر، نغمہ، احساس، سانسوں کا ترنم، ایک اضطرابِ جاں گداز، ہر ہونٹ، بدن پہ سجائی شباب ادائیں ۔ اور پھر زمین سے آسمان تک رنگ و نور کی بنی ہوئی ایک رہگذر ایسی ترتیب دیتی ہوئی کہ ہر جذبہ اور ہر آرزو کھلے بندوں فرار ہو جائے اور روح اپنی حلاوتوں میں ڈوب کر مدہوش ہو جائے ۔

اس سکراتے فرشتے کی معصومیت کو اس مغرور و خود پسند حسن کے شباب آلود اعتماد نے ایک ایسے بھرپور عشق میں ڈھال دیا کہ اس تن و مند گلہ بان کو خبر ہو گئی کہ وہ تو بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ جوان ہو گیا ہے ۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ فرشتہ انسان بن گیا ۔

نظر مجرم ہو گئی ۔ دل خائف ہو گیا ۔ ذہنی تصورات نے اپنے دن اور رات الگ بنا لیے اور بے قابو بدن کا ایک ایک حصہ چور بن گیا ۔

پھر وشالی نے ایک گناہ کر لیا ۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا گناہ تھا ۔ یہ گناہ اس نے بصد شوق و جنون کیا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ زندگی کی صحیح لذت صرف گناہ میں ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کیا جائے ۔

وشالی نے اس گناہ کا ایک اہتمام کیا تھا ۔ اس کی تربیت کی تھی ۔ اس گناہ کو عشق کی ساری آلائشوں سے پاک کر دیا تھا ۔ اس گناہ کے ماضی و مستقبل میں نہ کہیں آہ و بکا تھی نہ ہجر کی تڑپ تھی، نہ اختر شماری ۔ نہ نظروں کی غلط فہمیاں، نہ بے خوابیاں ۔ دل کو کسی درد سے سروکار ہی نہیں تھا ۔ اس لیے کہ ہر دھڑکن میں ایک التہابِ تشنگی تھی اور سیرابی کا یقین بھی ۔

وشالی نے اس نوجوان گلہ بان کے ہونٹ چوم لیے بالکل اس طرح جیسے تازہ

ہی آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور ہر طرف شعلے ہی شعلے لپکنے لگے اور زمین پر حدِ نظر
تک صرف انگارے ہی انگارے دہکتے نظر آنے لگے تو اُس نے ایک بار اوپر
اس طرح نظر اُٹھائی جیسے آسمانوں سے یہ کہہ رہا ہو "ٹوٹ پڑو"۔ لیکن جب
آسمانوں سے مایوس ہو گیا تو کچھ ایسی غضب ناک نظروں سے نیچے کی طرف گھورنے
لگا جیسے یقیناً ہو کر زمین شق ہو جائے گی۔ لیکن جب دھرتی نے بھی اس کی آس
پوری نہیں کی تو اچانک اس کا تپتا چہرہ مدھم پڑ گیا۔

اُس نے وشالی کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

تیز تیز چلتا ہوا دور دور تک پھیلے ہوئے انگاروں کو ٹھوکریں مارتا ہوا
وشالی کے گھر کی دہلیز تک پہنچ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کھٹکھٹاتا آہستہ سے گھر کا
دروازہ کھلا۔ وشالی نے مدن کا سواگت کیا نہ اسکو پرنام ہی کیا۔ بس
دروازے کے پیچھے ہی سے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ آخر کب تک ؟"

مدن نے چیخ کر کہا۔ "میں یہاں تمہاری کوئی بات سننے نہیں آیا ہوں۔ مجھے
تم سے کچھ کہنا ہے اور وہ بھی آخری بار"

"سننا تو مجھے بھی کچھ نہیں ہے۔" کہتے ہوئے وشالی پوری طرح دروازے
میں نمودار ہوئی۔ مدن کو ایسا لگا جیسے دروازے کی طرف سے نیلی نیلی آگ کا ایک
شعلہ اُسکی طرف لپکا اور اُسکے اطراف ایک ہالہ بن گیا۔ وشالی نے کہا۔

"مدن جی! جب تم پاپیوں کے گھر کی دہلیز تک آ ہی چکے ہو تو ادھر دروازے
کے اندر بھی آ جاؤ ۔۔۔ ویشیا کا دروازہ صرف مردوں ہی کے لیے کھلا رہتا ہے
مگر ۔۔ تم ۔ تو ۔۔۔"

"مگر ۔ میں ؟ ؟" اچانک مدن کا منہ کھل گیا اور یہ الفاظ نیچے زمین پر

گر پڑے۔ فضا میں ایک عجیب کا سماں ہوا جیسے کسی قید سے لیے ہوئے۔ رشمی نے اپنے
پیر میں پہنی زنجیر کو ایک جھٹکا دیا تھا۔ منڈن نے جھرجھری لی وحشت آمیز آواز میں پوچھا۔
"تم صرف اتنا کہنے آیا ہوا کہ تمھارا یہ گھروندہ اور اس کے دَر و دیوار صرف دو
گھڑی کے ہیں۔ اب تھوڑی دیر میں اس میں ہر طرف آگ لگ جائے گی اور تم جل کر بھسم
ہو جاؤ گی۔"
"میں جل نہیں سکتی منڈن جی۔ پاپ پاپیوں کو نہیں جلاتا۔ پاپ تو جلاتا ہے
دھرماتماؤں کو۔ تم نے جس مشعل سے ساری بستی میں آگ لگائی ہے وہ تمھارے کام
آتا نہیں، وہ تمھاری جلتی ہوئی پیاس ہے جس نے تم کو سارے کا سارا جلا کر راکھ بنا
دیا ہے۔ تم تو صرف راکھ کا ڈھیر ہو۔"
اس بات پر منڈن کا سارا وجود لرز گیا۔ اُس وقت نہ آسمان نے اُس کا ساتھ
دیا نہ زمین نے ـــ وہ چیخا۔ "تم جانتی ہو میری شکتی کو ـــ؟"
"جانتی بھی ہوں اور مانتی بھی ہوں۔ اس لیے منڈن جی مجھے بھسم کرنے سے پہلے
ایک موقع مجھے بھی دے دو کہ تمھاری شرن میں آ کر اپنے پاپ دھو ڈالوں اور اپنی آتما
کو پوتر کر لوں۔"
منڈن کو ایسا لگا جیسے اُس کے بدن کے تپتے ہوئے سے ٹھنڈی ہوا کا ایک
جھونکا ٹکرا گیا ہے۔ اُس کی نظر اٹھی تو اُس نے اپنے سامنے دروازے سے لگے کھڑے
میں ایک تپتی بجلی کو انسانی روپ میں دیکھا اور شاید اُسے محسوس ہو گیا کہ آگ
اور نور میں کتنا فرق ہوتا ہے ـــ وہ پھر بھی کڑک کر بولا۔
"میں جا رہا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا ـــ" وہ دہلیز سے نیچے اترنے
لگا تو وشالی نے کہا ـــ "میری ایک بات سن لو منڈن جی۔ آج رات میں تمھارے
گھر آؤں گی یہ دیکھنے کے لیے کہ ایک دھرماتما ایک ویشیا کا مقابلہ کیسے کرتا ہے

اگر میں ہار گئی تو میں اپنے کو جلا دوں گی۔ اور اگر تم ہار گئے تو وہ فیصلہ میں تم
پر چھوڑتی ہوں۔"

منمن پھنکارتا ہوا دندناتا وہاں سے لوٹ گیا۔ گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔

~

(٨)

رات کا سورج جاتے جاتے رازدارانہ انداز میں شب کے تاروں کے نام ایک پیام چھوڑ گیا کہ آج کی رات سب باخبر رہنا۔ آج کی رات جو کچھ بھی ہوگا وہ سب اپنی اپنی نظروں سے دیکھنا اور کل مڑکے ہی مجھے سب کچھ بتا دینا۔

جب آسمان پر ہر طرف تارے ہی تارے پھیل گئے تو سب تارے اپنے اپنے گروہ میں بیٹھ کر کانا پھوسی کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب ایکدوسرے کو پوری طرح سمجھ نہ سکے تو اپنی اپنی جگہ سنبھل گئے اور اپنی معصوم آنکھوں کو بار بار جھپکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ رات بھی جیسے اس سناٹے بیکراں میں تنہا اور چپ کھڑی تھی۔

منّدن نام کا کاہن اپنے گھر کے صحن میں بنے ہوئے ایک الاؤ کے پاس اپنے بھاری بھاری قدموں سے اس طرح ٹہل رہا تھا کہ زمین کانپ رہی تھی۔ منّدن کو جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ جس تیزی سے وہ ٹہل رہا ہے اسی تیزی سے اس کے بدن میں لگی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہے۔ اسکے اندر کی ہر چیز بجھ کر راکھ بننے لگی ہے۔ اس کے بدن کا لوہا ٹھنڈا ہوکر زیادہ سخت ہونے لگا ہے اسکی آنکھوں میں انگاروں کی جلن کی جگہ ٹھنڈک کی چبھن پیدا ہو رہی ہے۔ اپنے بدن میں گرمی پیدا کرنے کیلئے وہ الاؤ میں دہکتے شعلوں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس الاؤ میں وہ اپنی کیمیاگری کرتا تھا۔ جڑی بوٹیوں کو ایک بڑے سے کڑھاؤ میں پکا پکا کر امرت بنایا کرتا تھا اور بستی والوں میں بانٹا کرتا تھا کہ سب کے

روگ دور ہو جائیں۔ لیکن آج اچانک اُسکی اپنی آتما بیدار ہو گئی تھی۔ وہ الاؤ کے بہت قریب کھڑا ہوا اپنے بجھتے بدن کو سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے جب اس نے اپنے بدن کے لوہے کو چھو کر دیکھا تو لوہا اسے اور ٹھنڈا لگا۔ اُسکی آنکھوں کی ٹھنڈک کی چبھن دھیرے دھیرے اُسکے سارے بدن میں اترنے لگی۔ وہ وحشت زدہ ہو گیا اور ٹہلنے لگا اُس نے دیکھا کہ اس کے قریب جلنے والا الاؤ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی بیکراں تاریکیوں کو روشن کر رہا ہے۔ لیکن اُسکے اندر ایک چنگاری بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

وہ غضبناک ہو کر الاؤ کے اطراف تیزی سے گھومنے لگا۔ اُسکے ہاتھ اُس کے سینہ پر بندھے ہوئے تھے۔ اسکے ہونٹ بند تھے اور وہ اب اپنے اندر ہی اندر چیخنے لگا تھا۔ چلانے لگا تھا۔ چنگھاڑنے لگا تھا۔ اُسکے اپنے ٹھنڈے وجود کے خول میں ایک چیخ بار بار گونج رہی تھی۔

"آگ — آگ جلاؤ آگ — آگ — آگ جلاؤ — آگ۔

یکلخت اُسکے گھر پر ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ تنہا، چپ چاپ اور ٹھٹھرتی ہوئی رات ذرا چونک گئی۔ آسمان پر تاروں کی جھپکتی والی آنکھیں چوکنا ہو گئیں۔

پھر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک روشنی اندر آئی۔ اُس روشنی میں مہادان کا سارا وجود روشن ہو گیا۔ اُس نے اپنے آپکو دیکھا پگھلتا ہوا لوہا اور اسمیں چمکتے ہوئے پانی کے قطرے۔ اُس نے اپنے پپوٹے اس روشنی سے بچاتے ہوئے کہا۔

"تم آگئیں۔ میں جھوٹ نہیں کہوں گا مجھے تمہارا انتظار تھا۔"

مندن کی اس بات پر وہاں پھیلی ہوئی روشنی میں کچھ رنگ بکھر گئے۔

"مندن جی، تم بڑے ہی گنی ہو۔ لیکن تم نے اب تک جو جیون گذارا ہے وہ دراصل ایک کڑی سزا ہے، ایک ایسے گمبھیر پاپ کی جو تم نے پہلے کبھی کیا ہو۔ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری سزا کی مدت ختم ہو رہی ہے اور تم اب کوئی بہت بڑا اپنیہ کرنے جا رہے ہو۔ ہم تم سب انسان ہیں، ہیں نا؟"

"ہاں ہیں۔ ہم سب انسان ہیں — لیکن یہ بتاؤ تمھارا وہ گوالا کیسا ہے؟"

"وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا۔"

"کیوں؟"

"میں نے اُسے ایک بہت زور کا تھپڑ مارا تھا اور گھر سے باہر دھکیل دیا تھا۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے کہ وہ مجھ سے عشق کرنے لگا تھا۔"

مندن کو اچانک ہنسی آگئی۔ "اچھا تو تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ جوش و جذبے کو زیادہ دیر تک زندہ رکھا جائے تو وہ ایک ذمہ داری بن جاتے ہیں۔ اصول بن جاتے ہیں۔ مجھے اصولوں سے نفرت ہے۔ ہر فریب سے نفرت ہے۔ آدمی کا ایمان بھی ایک فریب ہے، مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"

روشنی کے سنجیدہ لہجے پر مندن کے اندر ٹھہرے ہوئے پانی میں کچھ بلبلے سے اٹھ گئے۔ اس نے کچھ ٹھنڈے لہجے میں پوچھا!

"سچ سچ بتاؤ، تم آج یہاں کیوں آئی ہو؟"

روشنی پر ایک نکھار سا آگیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تمھارے شہر میں آکر اپنے

تمہارے باپ میرے باپ ہیں۔ جاؤ تم ہار گئی ہو۔ میں جیت گیا ہوں۔ جاؤ۔ جہاں سے آئی تھیں چلی جاؤ۔"

الاؤ کے لپکتے شعلوں کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور فضا میں چنگاریاں بکھر رہی تھیں۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔"

اچانک جیسے روشنی کچھ کم ہو گئی۔ ہلکی سی ایک آواز آئی۔

"میں اپنی بات پر قائم ہوں منّدن جی۔ یہ ایک دیوی کی زبان ہے۔ میں کل اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو آگ لگا دوں گی اور تمہاری بستی کو پاپ سے پاک کر دوں گی۔ لیکن صرف تمہاری نظروں کے سامنے۔ تم ضرور آنا۔ ضرور آنا۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی۔" روشنی غائب ہو گئی۔

اب منّدن کے گھر میں ہر طرف اندھیرا تھا اور اس اندھیرے کے بیچ الاؤ جل رہا تھا۔ منّدن نے ان شعلوں کے پرے اندھیروں میں غور سے دیکھا۔ سیاہی میں ہلکی سبزی رنگ سی تھی یا پھر اس روشنی کا عکس باقی تھا جو چلی گئی تھی۔

اس نے اپنے جسم کو پھر سے چھو کر دیکھا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکل پڑی۔ اس کا سارا جسم آگ سے تپ رہا تھا۔ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے روم روم سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ لمبے بھاری قدموں سے تیز تیز چلتا ہوا گھر کے دروازے تک پہنچا۔ بڑے ہی بے ڈھنگے پن سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ حدِ نظر تک صرف گھُپ اندھیرا نظر آیا۔ اس نے کوشش کی کہ روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئے لیکن اوپر آسمان دکھائی دیتا تھا نہ نیچے زمین۔ اسے محسوس ہوا اس کی دہلیز کے آگے ایک اتنی گہری کھائی ہے جس کی کوئی تہ نہیں ہے۔ وہ فوراً پلٹ گیا اور وحشی کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بھاری بھاری سانسوں میں ٹھہر ٹھہر کے

گیا تھا۔ تھا۔ راستے میں پڑی ہوئی ہر چیز اُس کے پیروں تلے ٹوٹ رہی تھی۔ اُس کی شکل لوٹ آئی تھی۔ اُس میں اب کوئی انسانی کمزوری نہیں تھی۔ اُس میں ساری غیر انسانی قوتیں جاگ گئی تھیں۔ اگر وہ اپنے دروازے سے باہر نکل کر دہلیز پار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید وہ بستی بھر کو مسمار کر دیتا۔ اور روشنی کے گھر کا دروازہ توڑ کر گھس جاتا۔ لیکن اب وہ پھنکارتا ہا نپتا الاؤ کے گرد پھیرتا رہا۔ اُسکے قدم زمین کو روندتے رہے اور رات کا سینہ دہلتا رہا۔ لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ اچانک رات کے سینے سے ایک چیخ نکل پڑی اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

(۹)

پھر صبح کے سورج کی نرم نرم کرنوں کی سرخیوں میں، اس سربلند پہاڑی کے ڈھلوانوں سے بھیڑوں کے گلّے اُترنے لگے اور نوعمر گلّہ بان کمبل اوڑھے ہوئے، شانوں پر پتلی پتلی چھڑیاں تولتے ہوئے اور ڈھلوانوں اور چٹانوں پر کلیلیں بھرتے ہوئے، نیچے وادی میں اُترنے لگے تو بستی کا کچھ عجیب منظر تھا۔

ساری بستی پر ایک خوف سا طاری لگتا تھا۔ بستی کے سب لوگ ایک ہی سمت بھاگ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر بھی خوف طاری تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں خوشخبری نہ مل جائے۔ پھر سب لوگ ایک جگہ اکٹھا ہو گئے۔

کسی نے چیخ کر کہا۔ "ہاں یہ سچ ہے۔ لیکن یہ خون ہے آؤ ہم سب مل کر دیکھیں۔"

یہ کاہن منڈن کا گھر تھا۔ اُس کا دروازہ کھلا تھا۔ سب لوگ اندر گھس پڑے۔ اندر صحن میں بجھے ہوئے الاؤ کے قریب منڈن کا سرد بدن بڑے ہی بے ترتیب انداز میں پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے جلا ہوا ایک پیڑ پڑا ہو۔

ساری بستی والوں کی زبان پر اظہارِ افسوس تھا اور چہروں پر سکون۔ جیسے اُنکو وہ خوش خبری مل گئی تھی جس کا اُنھیں اندیشہ تھا۔

کسی بہت بڑی مکڑی نے جیسے ساری بستی پر ایک عرصے سے ایک جالا بُن رکھا تھا۔ بستی والے جب مجبور ہو کر آسمان کی طرف نظر اُٹھاتے تو اُنکی نظر اس جالے میں اُلجھ جاتی تھی۔ دور تک وہ دیکھ نہیں پاتے تھے۔ جالے کا میلا پن

جائے کا الجھاؤ، اُن کو اپنے سارے بدن پر پھیلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اور پھر
وہ کسی طرح اس احساس سے چھٹکارہ پانے کیلئے نظریں نیچی کر لیتے اور خوشی خوشی
جینے کی کوشش کرنے لگتے۔ لیکن اب کاہن کی موت کے بعد جیسے وہ جالا
کٹ پھٹ کر ہواؤں میں اُڑ گیا تھا۔ کہیں کوئی دھجی تک نظر نہیں آتی تھی۔
سب کھلا آسمان صاف ہو گیا تھا۔ نیلگوں ہو گیا تھا۔ بنا روک ٹوک اب
نظریں دُور دُور تک دیکھ سکتی تھیں۔ بس اس ایک احساسِ آزادی نے اُن
سب کو کہیں کا نہ رکھا۔ کسی دِشا کا، کسی سمت کا اُنھیں احساس نہ رہا ـــ
سب نے مل کر بستی کا منہ دھویا۔ نئے سورج کی کرنوں سے زر لیا اور نسیم سحر
کی ٹھنڈی ٹھنڈی مہک کو نچوڑ کر غازہ تیار کیا اور بستی کے دُھلے منہ پہ
مل دیا۔ ساری بستی چہکنے ہنسنے لگی۔ پھر سب اُس کا منہ چومنے لگے۔ جو نوعمر
تھے وہ تیزی سے بڑھ چڑھ کر جوان ہو گئے۔ اور جو جوان تھے وہ آگے بڑھ کر
پہاڑوں کی طرح سینہ سپہر ہو گئے۔ بستی کے اندر یا باہر کہیں کوئی ایسی سایہ دار
جگہ نہ تھی جہاں سکون نہ مل سکے۔

لیکن پھر بھی کہیں کہیں، کبھی کبھی تیز ہواؤں کے جھکڑوں میں، سیاہ بادلوں
کے اندر تڑپتی بجلیوں میں یا ندی کے شور میں، بستی والوں کو کاہن دکھائی
دے جاتا تھا۔ سنائی دے جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر ایک سوچ رہا ہو ـــ
کسی اور نے نہیں دیکھا، صرف مجھ ہی کو کیوں نظر آ گیا ـــ اور یہ ایک نظر
ایسی ہوتی تھی جیسے روشنی کی ہزاروں کرنوں میں کہیں گہرے اندھیرے کی
ایک لکیر موجود ہو ـــ

اس اندھیرے کی لکیر کا جنم شاید اس رات کی کوکھ سے ہوا تھا جس کی
صبح کے سورج نے دھرتی کی صورت کالی کر دی تھی۔ اس پہاڑی کی وادی میں

آکر وہی اندھیرے کی لکیر اچانک ایک کالی ناگن بن گئی تھی۔ وہ ایک غضبناک انداز میں پھنکارتی ہوئی، وادی میں سرگرداں رہنے لگی تھی کہ "وہ مل جائے۔ جس کے لیے اُس کے اندر کا سارا زہر اُس کی زبان پر آ گیا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی کہ بہت جلد وہ اپنا کام پورا کر دے۔ اُس زہر کی آگ کو صرف ایک نوجوان انسان کا گرم و لذیذ خون بجھا سکتا تھا۔ ناگن اس وادی کی جس روش، جس پگڈنڈی اور جس چٹان سے گذرتی تھی وہاں زہر کی ایک لکیر بن جاتی تھی۔

آخر اس وادی میں وہ نوجوان انسان بھی پہونچ گیا جس کے لئے زہر کی لکیروں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔

وہ پہاڑی کے ڈھلوانوں پر کودتا، پھاندتا، اپنے شرابی شباب سے سرشار، اپنے محبوب کے حسن کا سلسلہ تصور لیے، اُس کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ بڑے ہی بدمست جذبے کے ساتھ وہ ایک چٹان سے نیچے پھاند گیا۔

بس اُسی لمحہ لُسے اتنا محسوس ہوا کہ چٹان اُس کے سینے پر آ رہی ہے یا اچانک سورج غروب ہو گیا ہے۔ یا پھر زمین پھٹ پڑی ہے اور اسی میں وہ سما گیا ہے۔ چٹان کے نیچے ناگن نے اس معصوم گلے پان فرشتہ کو ڈس لیا تھا۔ جسے کبھی ایک مغرور و خود پسند حسینہ کے شباب خود اعتماد نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ بڑی شاہی شان و شوکت کے ساتھ جوان ہو گیا ہے۔

اُس کالی کلوٹی صبح نے اس گلہ پان کے ہلکے سرخ چہرے پر آ گئے ہوئے سنہرے پر سیاہی سی بکھیر دی اور اس کے سنہرے بالوں کا سونا اچانک چوری ہو گیا۔ پھر سورج بجھ گیا۔

اس حادثے پر جانے کیوں کبھی بستی والوں کو یہی خیال آیا تھا کہ رات اس وادی میں کالا ناگ آیا تھا۔ اس نے اپنے جی کا ارمان نکال لیا تھا۔ وادی

میں یہ دُور تک رینگنے والی کالی لکیر ناگن نہیں تھی، وہ کاہن تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ زندگی بھر اُس کی رگوں میں خون کی جگہ اُس کی اپنی بھری ہوئی خواہشوں اور زنگ آلود ارمانوں کا زہر دوڑتا رہا تھا۔ اس لئے بھی شاید اس کی رگوں میں کھولنے والے زہر نے اس کی موت کے بعد ایک ناگن کے روپ میں جنم لیا ہو۔ اور آج وہی زہریلی ناگن انسان کے خون کی پیاس لئے تڑپ رہی ہے۔ بل کھا رہی ہے۔

لیکن جب ابلیس نے سانپ کا روپ دھارن کیا تھا تو آدم و حوا نے جنت کھو دی تھی اور ایک دنیا بسا دی تھی۔

اُس معصوم گلہ بان کی موت پہ بستی کی ساری زندگی سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور ٹھٹک گئی تھی۔ ساری فضا میں ہلکا سا خوف و ہراس لرزاں تھا۔ وشالی کا گھر جیسے اچانک بستی کے سارے گھروں سے کٹ کر بہت دُور ہٹ گیا تھا۔ بستی سے دُور ہو گیا تھا اور اپنی جگہ اپنے مضبوط در و دیوار کیساتھ کھڑا ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ گھر کا دروازہ اس طرح بند تھا جیسے آنکھ بند کئے کوئی جاگ رہا ہو۔ اپنے احساس کی دھار کو تیز کیے ہوئے۔

دروازے پہ نہ کوئی ماتمی چادر تھی نہ کوئی صدمہ کی چلمن، صاف دکھائی پڑتا تھا کہ دروازے کے پیچھے ایک گہرا سناٹا ہے جس میں ایک ایسی آواز جنم لے رہی ہے جو کبھی دروازہ توڑ کر باہر نکل آئے تو آسمانوں تک پہونچ کر گڑگڑاتی بجلی بن جائے۔ اور بستی پر گر پڑے۔

لیکن جیسے جیسے گردشِ لیل و نہار میں کچھ فرق آ گیا، اور بستی کے سامنے سے گھوڑا میدان، سائے دشت دن گردش میں آ گئے۔ اپنے مقام بدلنے لگے۔ ایک دوسرے سے قریب ہونے لگے اور پھر یہ سب کچھ دیکھ کر سوچنے والوں نے سوچا۔

یہ ہمیشہ سے گھومنے پھرنے والی زمین اگر اپنے مدار میں قید نہ ہوتی اور اپنے محور پہ اس طرح نہ جھک جاتی تو شاید۔ شاید بہت ممکن ہے۔ ایسا سوچنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ کہ یہی زمین اپنے آسمانی نظام میں بالکل ایک دوسری زمین ہوتی۔ اس کا جغرافیہ ہی کچھ اور ہوتا۔ جغرافیہ کچھ اور ہوتا تو یقیناً تاریخ بھی اور ہوتی۔ اسکے موسم ہی جدا ہوتے یا پھر ایک ہی سہانا موسم ہوتا۔ صرف پھولوں والا۔ پھلوں والا۔ اونچی، اونچی فصلوں والا۔ ہر طرف ٹھنڈے میٹھے پانی کے کبھی نہ خشک ہونے والے چشمے ہوتے، جھیلیں ہوتیں۔ اس دھرتی کی مٹی ہی کچھ اور ہوتی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔ مرغزار ہی مرغزار۔ پھر اس مٹی سے بننے والا انسان بھی شاید ایسا انسان ہوتا جسے کبھی یہ یاد دلانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ انسان ہے۔ وہ تو صرف ہنستا گنگناتا ہوتا۔ کھیلتا کودتا ہوتا۔ ساری زمین پہ راج کرتا۔ نہ اتنے بدشکل ملک ہوتے، نہ یہ قید کرنے والی سرحدیں نہ اتنی ساری نسلیں ہوتیں نہ اتنی ساری تہذیبیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوتی کہ انسان کا ذہن ہی دوسرا ہوتا۔ نہ سیاست ہی ہوتی نہ نفرت، نہ جنگ ہی ہوتی نہ فتوحات۔ نہ برتری نہ کمتری۔ اس نظامِ فلکی میں آزاد سیارے پہ بسنے والے آزاد انسان کا دل کتنے سرور آگیں جذبات سے پر ہوتا۔ ہر طرف پیار ہی پیار ہوتا، حسن ہی حسن ہوتا۔ ہو سکتا ہے نہ کوئی رشتہ ہوتا نہ دشمنی، نہ تو پھر ماہ و سال ہوتے نہ وقت کی پیمائش۔ نہ وقت کے تقاضے، نہ وقت کے گذر جانے کا گھناونا احساس۔ ایک سدا جوان دنیا ہوتی اور ایک سدا جوان انسان۔ کہیں زندگی کی کمی ہوتی نہ موت کی ضرورت۔

شجر حجر، کوہ و دشت، بحر و بر اور سارے حشرات الارض ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ ایک ہی طرح جیتے۔ ایک دوسرے سے پیار کرتے۔

لیکن اس طرح بے معنی اور بے مصرف سے انداز میں سوچنا اگر تھوڑی دیر کے لیے دلچسپ بھی ہو تو بڑی کو نظر میں کس قدر بد وضع سی حرکت ہے۔ سوچنے کی حدود تو لاکھوں آسمان بھی نہیں بتا سکتے۔ اس لیے اس طرح بھی سوچا جا سکتا ہے کہ کیوں نہ ایک بار وقت سے دو قدم آگے بڑھ کر دیکھ لیا جائے کہ اس سیارے کے لیے آگے کیا کچھ ہے۔ اور کس قسم کا مستقبل اس کا منتظر ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سارے فلسفے، یہ نظام حیات، یہ سارے حوصلے اور یہ ساری امیدیں محض ایک خود ساختہ دام فریب ہیں۔ صرف ایک دام خیال ہیں یہ ایک بے بنیاد تصور ہے کہ اس سیارے پر کبھی انسان کو وہ زندگی بھی نصیب ہو سکتی ہے جس کا ہر فرد تصور ہی کر کے رہ جاتا ہے۔ تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ صدیوں سے کشید کیے ہوئے علم و دانش کی مدد سے خلاؤں میں کسی موزوں مقام پر پہونچ کر اس فلکی نظام میں یا اس سیارے کا مقام ہی بدل دیا جائے تاکہ اسکا انداز گردش ہی دگر ہو جائے۔ اسکا مدار ہی بدل جائے، اسکے محور میں فرق آ جائے، وہ بھی ایسا کہ اس سیارے پر بسنے والے سارے انسان اچانک ایک نسل بن جائیں، سب ایک رنگ ہو جائیں، ایک زبان ہو جائیں یا اس دھرتی تک پہونچنے والی روشنیوں میں صرف زندگی کی حرارت ہو، زندگی کا گداز ہو اس پہ چلنے والی ہواؤں میں صرف ایک ٹھنڈک ہو، اس پہ برسنے والے پانی میں صرف سدا بہار فصلوں کی جوانی ہو۔ ہر انسان کے پاس صرف وہی خواہش و تمنا ہو جو پوری ہوتی ہو۔ وہی احساس ہو جس میں صرف لذت ہوتی ہو، صرف وہی جذبہ ہو جس کی مکمل تسکین ہوتی ہو۔ بس زندگی ایک مسلسل زندگی بن جائے اور آسمانوں سے پرے بھی کہیں موت کا کوئی تصور نہ ہو۔

ایسی تمنائیں اور ایسے خیال تو اتنے ہی پرانے ہیں جتنے کہ اس دھرتی کے پتھر۔ ایسا تو پہلے انسان نے بھی سوچا ہوگا اور آخری انسان بھی سوچے گا اور انکا درمیانی وقفہ بھی زندگی ہوگی جو انسان کو صرف اس طرح سوچنے پہ مجبور کرتی رہے گی۔ اس لیے

کہ یہ وہی زندگی ہوگی جسے اس دھرتی نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ جب تک اس دھرتی کے انداز گردش میں فرق نہیں آئے گا۔ اس زندگی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔
کاہن نے بھی یہی سوچا ہوگا۔ فرشتے نے بھی یہی تمنا کی ہوگی۔ اس نوجوان مرغنے نے بھی ایک ایسا ہی عزم کیا ہوگا جس نے ایک دلیشیا کے بھیگے ننگے بدن کو اپنی باہوں میں لے کر ایک پاکیزگی بخش دی تھی۔ اس دلیشیا نے بھی ایک ایسا ہی خواب دیکھا ہوگا۔ اس کی اپنی ماں کے کردار کے پیچھے بھی شاید کسی ایسی ہی آرزو نے جنم لیکر دم توڑ دیا ہوگا۔ اور وشالی جس کے پاس زندگی کا تصور اس دھرتی کی مضبوط چٹانوں جیسا سخت تھا۔ زندگی کے ایسے ہی تصور کے قریب میں آ گئی ہوگی۔ ایسے ہی خیال کے جال میں پھنس گئی ہوگی۔

فرشتے کی اچانک موت کے بعد وشالی نے کیا کیا ہوگا؟ صرف سوچا ہوگا صرف سوچا ہی ہوگا اور یہی سوچا ہوگا کہ زندگی کو واقعی زندگی بنایا جائے۔ آدمی اس دھرتی پہ جینے کیلئے آیا ہے، مرنے کیلئے نہیں۔ جب ہر انسان ایک ہی طرح پیدا ہوتا ہے اور اسی مٹی سے پیدا ہوتا ہے تو پھر اسے اپنی من مانی زندگی گذارنے کیلئے کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ اس مختصر سی زندگی کو جو صرف ایک بار ملتی ہے، کیوں کسی قانون اور قید میں محبوس کر دیا جائے۔ آخر کسی دوسرے انسان کو مجھ پہ قانون کی پابندیاں عائد کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟

قانون کی پابند زندگی میں تو ان گنت لعنتیں ہیں، بدکاریاں ہیں، جو شاید غیر قانونی یا قانون سے آزاد زندگی کی لعنتوں اور بدکاریوں سے ہزار گنا زیادہ ہیں۔
قانون کی پہلی دین ہی جرم ہے اور اس کی برکتیں ہیں افلاس، غلامی، ظلم و تشدد، عیاری و مکاری، طبقات کی تقسیم، مساوات سے دشمنی، خود غرضی، محرومی، زندگی کا طویل اور کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ۔ اس قانون نے ایک عورت کو بیاہتا بنا دیا اور

ایک عورت کو آزاد دلیشیا۔ اسی قانون نے سیجے دھاتما کو سنگھار کیا اور اسی قانون نے ایک دلیشیا کو بھی نیج بتا کر سنگسار کیا ہے۔ پاپ اور پُن کے لیے ایک ہی سزا دی ہے اور اس سزا کو اس قانون نے ایک دلفریب نام دیا ہے "انصاف"۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک پرندے کو نام دیا ہے۔ "عنقا"۔

کیوں نہ دھرتی پر ہر قدم اس یقین کے ساتھ رکھا جائے کہ یہ دھرتی اپنی ہے کیوں نہ سر اُٹھا کر اوپر اس یقین سے دیکھا جائے کہ یہ آکاش سارا اپنا ہے۔ یہی تو وہ حوصلہ ہے جس کے ساتھ ہر انسان پیدا ہوا ہے لیکن اس قانون نے اُس سے وہ حوصلہ چھین لیا ہے۔

وشالی کے پاس کچھ ایسا ہی حوصلہ تھا اسی لیے تو اُس نے سوچا تھا کہ جب مرد اور عورت ایک دوسرے کیلئے پیدا ہوئے ہیں تو مرد سے دُور کیوں رہا جائے۔ کیوں نہ کسی حوصلہ مند مرد کو قریب کیا جائے اور زندگی کا لطف اُٹھایا جائے۔ صرف اس وقت زندگی، زندگی بن سکتی ہے جب آدمی اپنے آپ کو اس مقام پر پہونچا دے جہاں وہ بنا کسی گذری رات کا تصوّر کیئے ہر نئی صبح کو زندگی کی پہلی صبح سمجھے۔ اور صرف اس لمحے کو زندگی کا نام دے جو اُس کے پاس ہے جو اُس کے ساتھ ہے۔

وشالی نے جب قریب آنے والے ہر لمحہ میں ایک حسین رنگ دیکھی تو اپنی نظر کی کسی شوخ کرن میں ان دیکھے لمحوں کو پرو لیا۔ اُنکو اپنی پلکوں پر سجا لیا۔ پھر اپنی روشن، روشن آنکھوں سے وقت کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

کتنا سجیلا، من موہنا، جھکی پلکیں خود پسندی کی غماز۔ ابروؤں کے بولتے خم میں طنز و تبسم۔ ہونٹوں کی ہلکی ہلکی سرخ نمی میں چھپی ہوئی بے پناہ لذتوں کا عکس۔ بدن کے شعلوں میں سلگتی سرگوشیاں۔ قد نے جیسے شباب کو بڑھاوا دے دیا ہو یا پھر شباب نے قد بڑھا دیا ہو۔ چال میں ہر انگ سے نکلنے والے

مُبہم مُبہم سے سُر۔ اور یہ سُر فضا میں ہر طرف اس طرح پھیلتے ہوئے کہ دیکھنے والے کو اُس کی اپنی سانسوں میں کوئی مدھم سا گیت سنائی دینے لگے۔

گذرتے وقت کا ہر لمحہ وشالی کے پاس آکر جیسے ٹھٹک جاتا تھا، ٹھٹک کر پھول بن جاتا تھا۔ وقت چمن زار بن جاتا، زندگی پھولوں کی سیر کرتی اور وشالی کی ہر سانس معطر ہو جاتی۔ اُن معطر سانسوں میں اکثر یاد آجاتا تھا۔ فرشتہ

شبنم میں بھیگے ہوئے وہ سرخ سرخ اچھوتے ہونٹ، اُن پر اُگے ہوئے ریشمی بالوں کا بنایا ہوا جال اور اس جال کے لمس سے جسم کے روم روم میں جل گئے والی جھنجھن۔ انگ انگ میں دردِ ہی درد، اس پر ہوش وحواس کی بغاوت، کسی بے رحم جذبہ کا بھرا ظلم۔ تپتے بدن پر برستے چابک۔ بدن کے نازک حصّوں پر ابھرا بھر کر دبنے والے نشانات سے بھری۔ دہکتی سرخ وسفید جلد پر گلاب کی پنکھڑیوں جیسی طراوت، دہکتی شبنم میں تر بتر، لذّتِ وصال سے سرشار۔ ایک بے صبری، بے کلی اور پھر اُسکے بعد؟ بس جیسے جسم وجاں کی لذتوں کا، خوشبوؤں کا ایک طوفان گذر گیا

اب فضا خاموش ہے۔ جسم کے ہر ہر حصے میں ایک پُرسکون تبسم کی گدگداہٹ ہے اور مدھم مدھم سی سانسیں لیتی ہوئی زندگی ہے۔ یا پھر وہ یاد کبھی اچانک ایک ناگن کی طرح وشالی کے سامنے آکر تن جاتی۔ اُسے ڈس لیتی، ہر سریلی سانس پہ ایک زہریلی آری چل جاتی اور ہر لمحے کے بدن سے خون رسنے لگ جاتا۔

لیکن ایک حوصلہ مند انسان، لمحوں کے رسنے والے زخموں پہ اپنی جرات و برداشت کا مرہم لگاتا ہے اور ایسے زخم جب سوکھتے ہیں تو انہی سے ایک نئی زندگی کے احساس پھوٹتے ہیں ننھے ننھے، کومل کومل ——— کونپلوں کی طرح۔ اور ان کونپلوں کی سبزیوں میں لپٹی ہوئی ایک نئی بہار ہر طرف چھانے لگتی ہے۔

(۱۰)

ہر طرف پھیلے ہوئے سبزہ زاروں میں، ہماری بستی کے علاقے کے مخصوص سُرخ سُرخ پھولوں والے پیڑوں پر جب ایک نئی بہار آ گئی تو ساری بستی والوں کے لئے ہر صبح ایک نئی صبح ہو گئی۔

پھر ایک ایسی ہی نئی نویلی صبح آئی۔ تو ان سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا ایک تیز رفتار اسپ شاہی، ہماری بستی کے اندر دندناتا ہوا گھس آیا۔ سوار شہسوار لگتا تھا اور جیکے بشرے سے تو کوئی حضور پرنور معلوم ہوتا تھا۔ سارے دیش کا حاکم ــــ گورا صاحب! آنکھوں کی نیلاہٹ میں سارا آسمان پھیلا ہوا، جیسے وہ آنکھیں پوری طرح خبردار ہوں کہ انکی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ پتلی سنہری، تنی ہوئی مونچھوں میں چھپی چھپی مسکراہٹ، لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی ایک احساسِ تکبّر کی غماز تھی۔ پھر بھی اسکے لباس کو، اسکے چہرے کو، اسکی نظر کو اور اسکے اندازِ گفتگو کو ملا کر ایک ساتھ دیکھا جائے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ صرف ایک حاکم ہی نہیں ہے، انسان بھی ہے۔

ریت اور رواج کے مطابق بستی والوں نے صاحب کا سواگت کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حاکم کی مانگ پرجا پوری کرتی تھی، وہ بھی تعمیلِ حکم کی شکل میں اور چپ ہو جاتی تھی۔ پرجا کی کوئی مانگ نہیں ہوا کرتی تھی۔

بستی سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک خوبصورت مقام پر خیمے لگ گئے۔ دن بھر وہاں چہل پہل رہی۔ جب ساری بستی والوں سے صاحب نے اپنی مانگیں پوری کروالیں اور نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو اسکے چہرے پر تھکن کے آثار نمودار ہوئے۔ لیکن یہ تھکن دن بھر کے کام کی تھکن نہیں تھی، یہ تھکن تھی اسکے ذہن میں بار بار اٹھنے والے

اُس خیال کا کہ آخر یہ حکومت کب تک ؟؟

جب وہ آسمان کی طرف نظر اُٹھائے دیکھ رہا تھا اس وقت سامنے پہاڑی کے اوپر چاند طلوع ہو چکا تھا۔ ہلکی سی چاندنی میں وہ پہاڑی کسی معیّن شکل میں ڈھل رہی تھی۔ یہ پہاڑی اس دلیش میں بھی ہے اور یہ پہاڑی اُس دیش میں بھی ہے جہاں پہلی بار اُس نے خدا کا نام سُنا تھا۔ وہ انسان سے متعارف ہوا تھا۔ اُس دیش کی اُس پہاڑی کے خوبصورت دامن میں ایک بہت ہی قدیم اور پُر شکوہ چرچ تھا۔ اس پہاڑی کو دیکھ کر اُس چرچ کے گھنٹوں کی روح پرور آواز آج اسکے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ کبھی روز انہی گھنٹوں کی صدا سُنا کرتا تھا۔ اُس چرچ سے قریب، برف سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی ایک نہر تھی جسکے کنارے پر اُس کا مکان تھا۔ اُس کا مکان ایک چھوٹے سے ٹیلے پہ تھا اور اُس کے سامنے نشیب میں اُس چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے برف سے ڈھکے ہوئے گھر قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ جیسے اُس چرچ کے اندر منبر پہ پادری کھڑا ہوا ہو اور نیچے سامنے سب عبادت کرنے والے سر جھکائے کھڑے ہوئے ہوں۔ اور سب اپنی اور اپنے خاندان کی بھلائی اور سلامتی کی دُعا مانگنے کے بعد اپنے ملک کی آزادی کی دُعا بھی مانگ رہے ہوں خلوصِ دل سے سب دُعا مانگ رہے ہیں کہ " اے خدا اے برتر، ہمارے ملک کو بھی آزادی نصیب ہو جائے اور ہم سوائے تیرے اور کسی کے غلام نہ رہیں۔ آمین۔"

وہ دلیش بھی اُسی حاکم کا غلام تھا جس کا عملدار بن کر آج وہ صاحب اِس دیش والوں پر حکومت کر رہا تھا۔ اور اپنے خیمے کے باہر ٹھنڈی شام کی تازہ ہوا کے دھیمے پُر سکون جھونکوں میں بیٹھا اس طرح سوچ رہا تھا ـــ "کیا کوئی ایسا وقت بھی آئے گا جب اِس دنیا کے سارے انسان آزاد ہو جائیں گے اور کسی دوسرے انسان

کے غلام نہیں رہیں گے۔"

اچانک جیسے چرچ کے گھنٹوں کی روح پرور آواز فضاؤں میں گونجنے لگی

دوسری طرف بستی والے آج دن بھر مصروف رہے تھے بستی سے ہر قسم کی غذا خیموں تک پہونچا دی گئی تھی اور شام ہونے کے جب ہلکی چاندنی کچھ پُر اسرار بننے لگی تھی تو بستی کے مکھیا نے جائزہ لیا تھا کہ کس کس قسم کی غذا کی سربراہی ہو چکی تھی اور باقی کیا کچھ رہ گیا تھا؟ اُسے یاد آ گیا کہ ابھی کونسی غذا فراہم کرنی ہے اس نے فوراً دو تین کارندوں کو دشالی کے گھر بھیج دیا' یہ سوچ کر کہ چلو کہ کسی ویشیا کے پیٹ میں کسی گورے صاحب کا تخم آجائے تو بڑا مزہ آجائے گا۔ ادھر ویشیا تو ویشیا ہی رہے گی' کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔ لیکن ادھر ایک حرام کا گورا صاحب پیدا ہو جائے گا۔

~

(۱۱)

جب کارندوں نے کچھ سہمے سہمے انداز میں وشالی کے گھر کی دہلیز پہ قدم رکھا اور آگے بڑھ کر کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا تو بجائے گھر کے اندر سے کوئی جواب آتا، پیچھے راستے پر سے کسی نے گرجدار آواز میں پوچھا

"کون ہے وہاں؟"

کارندوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بڑا بھاری، لمبا تڑنگا نوجوان دہلیز کے قریب کھڑا تھا۔ کارندوں نے اسکے قریب جا کر اُس کو بغور دیکھا اور پھر آسمان کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہتے ہوں کہ وہ مینار کتنا اونچا ہے۔ اُن لوگوں نے اُسے پہچان لیا اور دبی آواز میں کہا۔

"ہم کو مکھیا نے بھیجا ہے۔"

"کس لیے؟"

"بائی جی کو بلانے کے لیے۔"

"کون بائی جی؟"

"وہ جو اس گھر میں رہتی ہے۔"

"وہ بائی جی نہیں ہے۔ وہ نہیں آئے گی۔ سمجھے؟"

"حضور پر نور کی خدمت میں بلایا گیا ہے۔"

"اچھا! تو تم میں سے کسی کی بیوی، بہن کو بھیج دو۔"

تینوں کارندوں کو اچانک اُس وقت احساس ہوا کہ وہ بھی عزت دار ہیں۔ اُن تینوں کو ایک ہی بات سوجھی۔ تینوں نے کچھ بھی نہ کہا، پلٹ کر لاٹھیاں اٹھا لیں۔

"خبردار جو کسی نے ہاتھ بڑھایا۔" وہ تو ی ہیکل نوجوان کچھ اس طرح گرجا جیسے وہیں کہیں بجلی گری ہو۔ تینوں کارندے گرج سن کر کانپ گئے۔ لیکن چونکہ اس نوجوان نے انکی بہن اور بیوی کو صاحب کے خیمہ تک پہونچا دیا تھا، نوجوان سے خوف کھانے کے باوجود انکی غیرت بھی برقرار رہی۔ وہ تینوں نوجوان کے قریب آنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی اس پر حملہ کرتا وہ خود ایک کارندے پر پل پڑا اور اسکی لاٹھی چھین لی۔ وہ پھر گرجا۔

"اب آؤ۔ زنڈیوں کی اولاد۔ دیکھتا ہوں کس میں ہمت ہے۔"

ان میں سے ایک کارندے نے بڑی ہمت سے جواب دیا "تم کو ہم کل دیکھ لیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ لبتی میں آج گڑبڑ ہو لیکہ صاحب یہاں ہے۔"

"ارے کل تو تیری اور تیرے صاحب کی ماں بہن میرے پاس آئے گی۔" نوجوان نے زور سے لاٹھی زمین پر ماری اور کہا "ہمت ہے تو اٹھا ہاتھ۔"

تیرے کارندے نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ساتھی کو روک دیا اور بولا "اچھا، ہم جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ایک دلیشیا کے گھر کے سامنے کوئی ہنگامہ ہو۔ ہم اپنی ہتک کا بدلا آج نہیں کل بھی لے سکتے ہیں۔"

وہ جانے لگے تو نوجوان نے پہلے ان کی طرف منہ اٹھا کر تھوک دیا۔ پھر بولا "نامردو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمھاری ماں نے تم کو دم کے ساتھ جنا تھا جس کو دبا کر تم سب بھاگ رہے ہیں۔ پھر کبھی اپنے آپ کو مرد سمجھ کر ایسی حماقت نہیں کر بیٹھنا۔ اس بار بچ گئے۔ جاؤ۔ تھو۔"

اس ذلت کے باوجود تینوں کارندے اس طرح چپ چاپ چلے گئے جیسے وہ ان سب باتوں کے عادی تھے یا پھر اس قسم کے رویہ کے لیے ان کو جانوروں کی طرح سدھایا گیا تھا۔ جب وہ تینوں کارندے چلے گئے تو نوجوان نے ایک بڑی ہی فاتحانہ نظر اوپر دمکتے ہوئے چاند پر ڈالی۔ چاند بہت اوپر آ چکا تھا۔ غصہ میں تپتے ہوئے نوجوان

کے بدن پہ چاندنی کی ٹھنڈک دھیرے دھیرے اثر کر رہی تھی اس کے کسرتی جسم کے خون میں اب تک جو ایک جلن سی تھی وہ ایک لذت میں بدل رہی تھی۔ وہ اسی طرح کھڑا سوچ رہا تھا کہ پیچھے گھر کا دروازہ کھلا۔ وشالی دروازے سے نمودار ہوئی تو چاندنی کی بے حساب کرنوں نے آگے بڑھ کے قدم چوم لیے۔ چاند نے بھی آسمان پہ اپنا عکس دیکھا۔

وشالی کو اس طرح باہر دیکھ کر اس نوجوان کی باچھیں کھل گئیں اور اسے یقین ہو گیا کہ ایک خطرناک بازی میں اس نے زمانے کی حسین ترین رات جیت لی ہے۔ لیکن اچانک اس کی سلگتی نظریں بجھنے لگیں۔ وشالی نے کڑک کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟ تم کو میرے معاملات میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟ مجھے کسی مرد کی ہمدردی سے نفرت ہے۔ میں کسی کا اس طرح مفت میں احسان لینا نہیں چاہتی۔"

نوجوان نے فوراً کہا۔ "مفت نہیں تو اس کا کوئی صلہ دے دو۔ اپنی ساتھی کا صدقہ"

نوجوان کی ہمت پہ گھڑی بھر کے لیے وشالی چونک گئی۔ چپ رہی پھر اسی آواز میں جواب دیا۔

"تم جیسے نوجوانوں کے لیے میرے پاس کوئی بھیک نہیں ہے"

نوجوان کو اچانک ہنسی آ گئی۔ اس نے بڑی ہی صاف آواز میں کہا۔ "میں ایک دن یہ بھیک لے کر رہوں گا" وہ پلٹ کر جانے لگا۔ دہلیز پہ پہنچ کر وہ ایک بار پھر پلٹا اور بولا۔ "مجھے راجہ کہتے ہیں" اور دہلیز سے نیچے ایک چھلانگ لگا دی پھر راستے پہ تقریباً دوڑنے لگا اور گلیوں میں غائب ہو گیا۔

ان گلیوں سے بھاگتے ہوئے وہ ایک الٹی گلی میں پہنچ گیا جہاں روشنی بھی ایسی تھی جیسے چاند اور ستارے آسمان سے بہت نیچے اتر آئے تھے اور اس گلی میں جھانک رہے ہیں۔ اس گلی میں دوڑتے ہوئے اسے اپنا سارا بدن بہت

سارے بدن سے سوچ رہا تھا۔ ایک نشہ سا تھا جسکے اُترتے ہی وہ ننگا ہو گیا۔ گھوڑے سوار کی آواز پر وہ کچھ ٹھٹکا۔ پھر غور سے اسکی طرف گھڑی بھر دیکھتا رہا اور بولا۔

"اچھا جاؤ ۔ آتا ہوں۔"

"نہیں، تم کو ساتھ لانے کا حکم ہے۔"

نوجوان نے پھر ایک بار گھوڑے سوار کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "اچھا چلو۔" وہ گھوڑے سوار کے ساتھ ہو گیا۔

ناہموار راستے پر بکھرے ہوئے پتھروں پہ گھوڑا بار بار پھسل رہا تھا۔ سوار بے ڈھنگے پن سے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا آسمان پر چاند تھا اور پیچھے وہ نوجوان جو گھوڑے کے ساتھ ساتھ سر جھکائے چل رہا تھا۔ نوجوان اپنی گہری سوچ کے گہرے بادلوں سے گذر رہا تھا۔ اُسکے اندیشے یقین میں بدل رہے تھے۔ صاحب کا بچہ اور کیوں بلائے گا۔ یہی ناکہ میں نے اُسکے مکھیا کے بھیجے ہوئے کارندوں کی ہتک کی تھی انکو ڈرا کر بھگا دیا ہے مکھیا کے کہنے پر وہ مجھے سزا دینا چاہے گا۔ میری بے عزتی کرنے کی کوشش کرے گا۔ بہت طیش میں آ جائے گا تو مکھیا سے یا اُن کارندوں سے کوڑے لگوانے کا حکم دے گا۔ لیکن آج ایک بات تو پکی ہے وہ مغرور اگر میری ہتک کرنے کی کوشش کرے گا تو چاہے آج جان چلی جائے میں بھی صاحب کے بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی بھی آدمی بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے اگر وہ اپنی جان پر کھیلنے کو تیار ہو جائے۔ ایسے ہی چند لوگ جان پر کھیلنے کو تیار ہو جائیں تو وہ دنیا میں سب سے بڑا انقلاب لا سکتے ہیں ہر ظلم کا کلیجہ نکال کر کھا سکتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ ہم سب کیوں غلام بن جاتے ہیں۔ کیوں ہار مان لیتے ہیں۔"

چلتے چلتے ایک پتھر پر اُس کا پیر پھسل گیا۔ اُس نے اُس پتھر کو بڑے ہی غصے سے اپنے پیر سے ایک طرف دھکیل دیا۔

"آخر آج میرا قصور کیا ہے؟ میں نے ایک عورت کی عزت بچائی ہے۔ میں نے ایسا

ہلکا ہلکا سا لگا۔ بدن کی حرارت میں عجیب مستی سی محسوس ہوئی اور سانسوں میں طراوٹ آگئی۔
گلی سے نظر آگے گئی تو چمن زار نظر آیا۔ ہر طرف ہلکی ہواؤں میں جھومتے ہوئے
رعنا رنگ کے پودے۔ ان پودوں پر ہلکے سبز رنگ کے پھول۔ ان پھولوں سے
چھوٹتی ہوئی گدگداتی خوشبو۔ اس خوشبو میں ایک پیام اور اس پیام میں ایک بہار آفریدہ
یقین۔ وہ یقین اصل شباب، شباب کا امین۔

نوجوان جب اس چمن زار میں پہونچا تو دھرتی سے اسکے قدم اٹھ گئے اور وہ
صدرنگ مدہوشیوں کے رتھ میں بیٹھ کر آسمانوں کی طرف اڑ گیا۔ اس پر یقین اور کی راجدھانی
کی طرف جہاں اسکے استقبال کا اہتمام ہونے والا تھا اور اسکے بعد اسے ایک کبھی نہ ختم
ہونے والی زندگی گذارنی تھی، ان آسمانی محلوں میں اس ماہ لقا کی جلوت و خلوت میں رہنا تھا!
جس کا حسن لازوال ضمانت تھا سارے آسمانی رنگ و نور کا ایک طلسم ہوشربا کا، جہاں
پہونچ کر آدم زاد اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور جنوں خیز لذتوں میں تحلیل ہو جاتا ہے
جب نوجوان اپنی اڑان میں، اندراستھان کے کچھ پرے پہونچ گیا تو اچانک
اس نے دیکھا کہ اس جہانِ رنگ و بو پر اندیشوں کے سیاہ سیاہ بادل چھانے لگے ہیں، گرجنے
لگے ہیں۔ گھڑی بھر میں ہر طرف سیاہی چھا گئی۔ سیاہ بادلوں میں ایک ایسی بجلی کڑکی جیسے سارے
جہاں پر گر پڑی ہو۔

اب اس کی آنکھوں میں اندھیرا تھا اور پیروں تلے سخت زمین، وہ اپنی بستی کی
اس گلی میں پہونچ گیا جہاں اسکا گھر تھا۔ جب اسکی آنکھوں سے اندھیرا چھٹنے لگا تو اسے
اپنا گھر نظر آیا اور گھر کے سامنے ایک گھوڑا سوار۔
جب وہ اپنے گھر تک پہونچ گیا تو گھوڑے سوار نے کڑک کر کہا۔
"حضور پیڈ نند کا حکم ہے کہ تم کو فوراً پیش کیا جائے۔"
نوجوان کو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب تک اپنے دماغ سے نہیں اپنے

کر سکے کوئی تیر نہیں مارا ؛ یہ تو پہلا فرض مردانگی ہے کہ عورت کو محفوظ رکھو ' خطرہ خود مول لے لو ' پھر اس عورت کے لیے جس کو سورج ' چاند اور ستارے روز گھور گھور کر دیکھتے ہیں بہت ممکن ہے کل یہی عورت سارے گاؤں کی عزت بن جائے۔ بہت بہت ممکن ہے کہ یہ عورت ــــ بہت ممکن ہے کہ یہ جوانی ــــ بہت ممکن ہے کہ یہ حسن ــــ بہت ممکن ہے میں اس صاحب بہادر کے بچے کی جان لے لوں گا۔ سارے خیموں کو آگ لگا دوں گا۔ مکھیا اور اس کے کارندوں کو ہرے بھرے پیڑوں سے باندھ کر ان کی جڑوں میں آگ لگا دوں گا۔ دیکھتا ہوں آج یا تو میں مر جاؤں گا یا ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں۔ دیکھتا ہوں۔"

اس نے دیکھا چاندنی میں بکھرے ہوئے سبزہ زاروں پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے ' سفید سے ہوئے خیموں کے قریب قریب کہیں کہیں جلتی ہوئی آگ۔ ایک خیمہ کے باہر دو گیاس بتیاں روشن ــــ کچھ خیموں کے سامنے جلتی ہوئی قندیلیں ــــ ایک دو خیموں سے نکلتا ہوا دھواں ' فضا میں پھیلتا ہوا۔ ہلکی ہلکی آوازیں ــــ ان آوازوں سے کچھ دور پیچھے وہ بلند پہاڑی جیسے چہرے پہ دو کئی آنکھیں اس سامنے منظر کو بغور دیکھ رہی ہیں۔

نوجوان نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس نے اپنے آپ کو باخبر کر لیا۔ "ہاں وہی دو گیاس بتیوں والا خیمہ ہے جہاں میرے مقابل آنے والا جوان بیٹھا ہو گا۔ اس نے اگر آج مجھے ایک گالی بھی دی تو بس میری کمر میں چھپا ہوا خنجر ہے بجلی کی رفتار سے اس پر جھپٹ پڑوں گا اور اس سے قبل کوئی دوسرا آگے بڑھ سکے ' اس صاحب کے بچے کا کام تمام کر دوں گا۔"

اب وہ خیموں تک پہونچ چکا تھا۔ سب سے پہلے وہاں آٹھ دس گھوڑے بندھے نظر آئے۔ نوجوان کو ساتھ لانے والا سوار وہاں گھوڑے سے اتر پڑا اور ایک کھونٹے سے اپنا گھوڑا باندھ دیا اور نوجوان کو ساتھ چلنے کے لیے بولا۔

پہلے خیمے کے سامنے آگ جلائی ہوئی تھی اور کچھ لوگ آگ کے قریب کھڑے باتیں

کر رہے تھے۔ اس نوجوان کو آتا دیکھ کر سب یکلخت چپ ہو گئے اور اس کی طرف گھورنے لگے۔ ان سے قریب آگے دو پولیس کے سپاہی وردی پہنے کھڑے تھے۔ نوجوان کو ساتھ لانے والے سوار نے اس کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ ایک سپاہی نے اس سے کہا۔

"میرے پیچھے آؤ"

وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور آگے دو اور چھوٹے چھوٹے خیمے تھے جن کے سامنے قندیلیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں خیمے ابھی آپس میں کچھ بات کر رہے تھے اور اچانک اب چپ ہو گئے ہیں۔ وہ اور آگے بڑھا تو ایک کھلی جگہ پر کچھ لوگ قریب قریب کھڑے نظر آئے۔ وہ سب اس کی بستی کے لوگ تھے۔ پچھلے تو بستی کے تین چار اشد گر کھڑے تھے جو اس کی طرف دیکھ کر اپنی مونچھیں مروڑ رہے تھے۔ ان سے آگے بستی کے بنیے بقال سیٹھ ساہوکار تھے جو ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے اور اب بھی وہی اپنی خاندانی کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔ ان سے ذرا آگے ایک چارپائی پر بستی کے مذہبی پیشوا لگیٹ پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور سب اس وقت اس نوجوان کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے اسکو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہیں۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا فضا خاموش ہوتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ اور اس بڑھتے ہوئے سناٹے میں اسکے اندیشے دھیرے دھیرے بولتے ہوئے یقینوں میں بدلنے لگے کہ اب اچانک ایک دھماکہ ہوگا اور سناٹا ٹوٹ جائے گا۔

شاید ایک گولی، ایک تیر، ایک گرج۔ اس خیال نے اسے سر سے پیر تک ایک خطرے سے باخبر کر دیا۔ اب اسکے سامنے وہ خیمہ تھا جہاں دو گیس کی بتیاں جل رہی تھیں اور جس کا اندرونی حصہ بھی کافی روشن تھا۔ خیمہ کے سامنے ایک شامیانہ لگا ہوا تھا شامیانے کے اندر فرش پر ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی۔ دری پر ایک طرف لگی ہوئی

میز کے پاس پیشی کا داروغہ بیٹھا ہوا تھا۔

نوجوان کے سامنے چلنے والے سپاہی نے داروغہ کو سیلوٹ کیا اور نوجوان کو وہاں چھوڑ کر خود پیچھے لوٹ گیا۔ داروغہ نے نوجوان کو نیچے سے اوپر بہت غور سے دیکھا اور مسکرا پڑا۔ پھر نوجوان سے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"راجہ"

"کیا کام کرتے ہو۔؟"

"ساری بستی کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

جواب سُن کر داروغہ ہنس پڑا تو نوجوان نے کہا "میری زمین بھی ہو"۔

"شادی ہو گئی تمھاری؟"

"نہیں۔"

اس قسم کے سوالات اور جوابات کے باوجود نوجوان پوری طرح باخبر اور مستعد انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی کہ وہ حملہ کر دے گا۔

داروغہ نے کچھ سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے سرکاری کارندوں کے کام میں بے جا دخل دیا۔؟ اُنکو ڈرایا، دھمکایا — اُن پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اُنکی بے عزتی کی؟"

"یہ سب صحیح ہے۔"

"کیوں تم نے ایسا کیا؟"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں ساری بستی کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ خیمے کے اندر سے ایک گرج سنائی دی۔

"تم کون ہوتا ہے بستی کی دیکھ بھال کرنے والا؟ یہ سرکار کا حق ہے" یہ کہتے ہوئے

گورا صاحب بہادر تیزی سے خیمے کے باہر آکر اُس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اُسکے ہاتھ میں اس وقت دونالی بندوق تھی۔ اُسکے گورے اور غصہ سے تمتماتے ہوئے چہرے پہ گہری نیلی آنکھوں کی چمک نے نوجوان کی نظروں کو خیرہ کر دیا۔ دوسری طرف داروغہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

نوجوان کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ اُس کی آنکھوں میں معاً ایک وحشیانہ چمک سی اُبھر کر دب گئی۔ بس اس سے آگے اس گورے نے کچھ کہا اور میرا خنجر اُس کے سینے میں ـــ

اُس کی ایڑھیاں زمین سے اُٹھ گئیں۔ اُسکے نتھنے پھول گئے سینہ پھول گیا اُسکا ہاتھ اُسکے خنجر پہ پہونچ گیا۔ صاحب بہادر پھر گرجا۔

"سیدھا کھڑے رہو۔" بندوق نوجوان کے سینے سے لگ گئی۔ داروغہ سٹپٹا گیا نوجوان نے پلک جھپکتے میں بندوق کی نالی اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی۔ صاحب چیخا۔

"یہ ہمت! دیکھو گولی چلا دے گا ہم۔ تمہارے جرم کی سزا یہی ہے۔ اگر سچی ہمت ہے تو ہماری طرف دیکھو۔"

نوجوان نے بڑی ہی خونخوار نظروں سے صاحب کی طرف دیکھا۔ بندوق کی نالی سے اُس کے دونوں ہاتھ اچانک چھوٹ کر نیچے جھول گئے۔ صاحب کے چہرے پہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ صاحب نے آہستہ سے بندوق کی نالی اُسکے سینے سے ہٹالی۔ اور کہا۔ "ہم تم کو یہ سزا نہیں دے گا۔ سمجھا؟ اور ایسا ہم تم پہ کوئی احسان نہیں کر رہا۔"

یہ سنتے ہی نوجوان کے بدن سے پسینہ چھوٹ پڑا اور سارے بدن میں ایک کسیلا احساس چھا گیا۔ جیسے ہر مسام میں بجا ہوا کوئی زہر نکل پڑا ہو۔ اُسے ایک تھکن سی محسوس ہوئی۔ اُس نے ایک بار پھر صاحب کی نیلی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہاں ابھی ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی صاحب نے اپنے ہاتھ میں بندوق کو جھلاتے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ تم نے وہ کسم کا عورت کو کیوں بچایا؟"

نوجوان نے بلا جھجک جواب دیا۔

"عورت کی حفاظت ہمارا فرضِ مردانگی ہے۔ اور مظلوم کی مدد ہماری شانِ مردانگی ہے۔"

صاحب بہادر تیزی سے نوجوان کے قریب آ گیا۔ اسکی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"ہم سے ہاتھ ملاؤ۔" نوجوان کچھ جھجکا۔ پھر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھ کر بڑے ہی گرمجوشی سے صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں کے ہاتھوں نے بڑی ہی گرمجوشی بتائی۔ صاحب نے اسکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ہاتھ کا گرمی بتاتا ہے۔ تمہارا آنکھوں میں کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ تمہارا بہادری کا ثبوت ہے۔" پھر نوجوان پر جھک کر اسکے کان میں کہا۔ "او مین۔ کبھی ہم نے بھی ایک بہت خوبصورت لڑکی کو اپنا خطرہ سے بچایا تھا۔" صاحب زور سے ہنس پڑا۔ دونوں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ صاحب نے بہت دور کہیں آسمان میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر مسکرا کر نوجوان سے بولا۔

"ہم تم کو ایک نشانی دینا مانگتا ہے۔ انکار مت کرنا۔ ہم کو معلوم ہے تم جیسا لوگ ہم جیسا لوگ سے کوئی نشانی لینا اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر یہ نشانی ہم ایک انسان ہونے کے دوست جیسا تم کو دینا مانگتا ہے۔"

صاحب تھوڑی دیر کے لیے خیمے کے اندر گیا اور پھر لوٹ آیا۔ نوجوان کے قریب جا کر بولا۔ "ہماری طرف سے یہ نشانی قبول کرو۔"

صاحب کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت خنجر تھا۔ اسکی نیام پر اودے رنگ کا مخمل لپٹا ہوا تھا۔ اسکا دستہ سنہری تھا۔ نوجوان نے بڑے ہی شکریہ آمیز انداز میں وہ تحفہ قبول کیا۔ دونوں نے پھر ہاتھ ملائے۔ تب صاحب نے کہا۔

"او مین اب ذرا پلٹ کر دیکھو۔"

نوجوان نے پلٹ کر دیکھا۔ بستی کا مکھیا اور دونوں کارندے سر جھکائے کھڑے تھے۔ صاحب نے نوجوان سے کہا۔

"تم جو سزا بولو گے ہم ان تینوں کو دے گا۔ بولو۔ انکو کیا سزا دینا مانگتا ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "اس وقت میں صرف ان سب کے منہ پر تھوک دینا چاہتا ہوں"

اس نے پیچ پیچ ادھر بڑھ کر مکھیا اور کارندوں کی طرف تھوک دیا۔ ان لوگوں سے پیچھے بستی کے وہ سب پنچ، بقال، سیٹھ ساہوکار، مذہبی پیشوا، سرکاری خدمت گار وغیرہ کھڑے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے وہ سب اچانک ہنس پڑے اور تالیاں بجانے لگے۔ ان تالیوں میں نوجوان کے کارنامہ کی نہیں بلکہ سرکار کے انصاف اور اس کی انصاف دوستی کی ستائش تھی۔ ان کی خوشامد تھی۔

نوجوان نے صاحب بہادر سے اجازت چاہی اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

(۱۴)

آسمان پہ چاند بہت اوپر آگیا تھا۔ نوجوان کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی آگئی تھی جس میں سارا ماحول جگمگا رہا تھا۔ وہ اسی راستے سے واپس ہو رہا تھا جس راستے سے کہ وہ آیا تھا۔ وہ سارے خیموں کے پاس سے گذر رہا تھا۔ اب بھی سب خاموش تھے لیکن اب وہ پھیلتا ہوا سناٹا نہیں تھا۔ ساری فضا میں مدھم مدھم دلفریب جی کو گدگدانے والی کچھ ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن کو سن کر یہ یقین ہونے لگے کہ انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق بھی ہے۔ اس کائنات میں ہے جو انسان کی سچی فتح پر خوشیاں مناتی ہے۔

وہ خیموں سے کچھ دور نکل گیا۔

چاندنی میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبزہ زار۔ ان کے ریشمی سبزے پر پھیلے ہوئے کتنے ہی چشمے ہوں گے۔ بہتے ہوئے سُبک سار جھرنے ہوں گے اور وہ سب اس وقت ضرور کوئی میٹھا سا گیت گا رہے ہوں گے۔ اس کی نظر کے سامنے ابھرنے والے سُرمئی کہسار سر تسلیم خم کر رہے ہوں گے۔

"ہماری سر بلندیاں ہیچ ہیں تمھاری سر بلندیوں کے آگے۔" چاند ستارے سب مل کر کہہ رہے ہوں گے۔ "آؤ۔ اِدھر آجاؤ۔ دیکھو یہاں کتنا سہانا آسمان ہے ہر طرف نیلگوں چاندنی ہے۔ ان نیلاہٹوں میں بکھرے ہوئے سرخ و سفید پھول ہی پھول ہیں ان میں گلابی ٹھنڈکیں ہیں۔ اِدھر آجاؤ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہ دلیر اور بہادر انسان کا سواگت ہوتا ہے۔ ایسے انسان پہ یہاں زندگی کی ساری لذتیں نچھاور کی جاتی ہیں اور اسے زندگی کا ایک ایسا عیش میسر آتا ہے جو مرد کی دلیری اور بہادری کا دیوانہ ہوتا ہے۔

اک حسن، اک شباب تازہ۔ اپنے سارے عشوہ و ناز اور اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ عشق خودسر کی آغوش میں گر کر مدہوش ہو جاتا ہے۔ اور گنگناتے رنگ و نور میں اس کی ساری رات بسر ہو جاتی ہے۔"

نوجوان کو ان آوازوں نے اِن سرگوشیوں نے خوب ورغلایا ہوگا۔ بہکایا ہوگا۔ دیکھو خارِ فطرت یہی ہے۔ فطرتِ انساں یہی ہے کہ آزمائشِ شمشیر و سناں سے تو فتحیاب گذر گئے اب دورِ طاؤس و رباب پہ تمھارا اقتدار ہے۔

اُسے اچانک اپنے بھاری قدموں کے نیچے سخت سخت زمین کا احساس ہوا، اس لیے کہ اُن ساری غیر انسانی آوازوں میں اُس نے ایک عجیب دلچسپ قہقہہ سُنا۔ چاندنی میں جھلکتے ہوئے بوڑھے پیپل کے پتے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ بستی کی سرائے کے پاس کھڑا ہوا یہ پیپل کتنا پرانا ہے۔ اس کے سائے میں کھڑے ہوئے نوجوان نے سوچا اور اپنے ہوش و حواس سنبھالے۔

پیپل کے سامنے ایک تنگ گلی۔ گلی میں آگے ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان۔ اس خوبصورت مکان کی چہ دیواری میں ایک نوجوان حسینہ کے ترستے پیاسے بدن سے نکلتی ہوئی جھنکار۔ ایک ساز کے مدھم میٹھے سُروں میں مدغم ہوتی ہوئی۔

"رُکمنی بھی تو ایک اپسرا ہے۔" نوجوان نے سوچا اور سرشار ہو گیا۔ چلو اُسی کے پاس۔ شاید وہیں آ کر یہ چاندنی نیلگوں ہو جائے۔ اُن نیلاہٹوں میں پھول ہی پھول بکھر جائیں۔ گلابی ٹھنڈکیں پھیل جائیں اور وہاں ایک ایسا عیش میسر آ جائے کہ اک حسن شباب تازہ اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ میری آغوش میں گر کر مدہوش ہو جائے اور پھر گنگناتے رنگ و نور میں ساری رات بسر ہو جائے۔

نوجوان نے رُکمنی کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

---

(۱۳)

رکمنی ایک ایسے رشی کی بیٹی تھی جس نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد تیاگ لے لیا تھا۔ رشی کے فلسفیانہ مزاج نے اسکی زندگی میں آنے والی پہلی ہی عورت کو کچھ اس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا جیسے اس عورت کے کھو جانے کے بعد اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ پھر زندگی بھر کوئی اور عورت اسے نہیں مل سکتی۔

اس کی بیوی بھی اپنی فطرت، اپنے مزاج اور اپنے طور طریق سے ایسی ہی لگتی تھی جیسے وہ پیدا ہی رشی کے لئے ہوئی ہو۔ اس لئے بھی وہ اپنے حسن و شباب کے باوجود بیوی زیادہ اور عورت کم لگتی تھی۔ رشی کے فلسفیانہ مزاج نے اس کے خوبصورت جسم کو سر سے پیر تک اپنے اندر سمیٹ کر محفوظ کر لیا تھا اور اسکے بیوی پن کو ایک درجہ ایک رتبہ دے کر اسکی تقریباً پوجا کی تھی۔

دونوں بیتے ہوئے لمحے کچھ اس طرح بیت گئے کہ لگتا قریب اور نزدیک جیسے سانس بھی ایک ساتھ لیتے ہوں کہ دل بھی ایک ساتھ دھڑکیں۔ اس طرح وہ دونوں قریب دس سال تک ایک ساتھ رہے۔ اس دوران انکی اولاد میں ایک لڑکا ہوا اور ایک لڑکی ہوئی۔

ان سب کی زندگی بالکل ایک ایسا ساز لگتی تھی جسکے سارے تار برابر سُر اور تال پر ایک ساتھ بج رہے ہوں۔ لیکن ہوا ایسا کہ اچانک ایک تار ٹوٹ گیا اور ساز بند ہو گیا۔ ساز سے نکلنے والا سنگیت فضا میں بکھر گیا۔ رکمنی کی ماں مر گئی۔

جب اس دس سال کی زندگی سے اپنے آپ کو اچانک ٹوٹا ہوا پایا تھا اس وقت رکمنی کی عمر پانچ سال تھی اور اسکے اطراف بکھرا بکھرا، خاموش، خاموش ایک سنگیت تھا جو چپکے چپکے اسکے معصوم دل کی دھڑکنوں میں چھپا جاتا اور اس کی کرچیاں اس سے

وجود کے ریشے ریشے میں دھنسنے لگتیں۔

دکھوں کے فلسفیانہ مزاج والے باپ نے بیوی کے اچانک مر جانے پر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نہ سوچیں گے' نہ کوئی احساس جاگے گا۔ مردہ آدمی سانس نہ لے سکتا ہو لیکن سانس لینے والا تو مردہ بن کر جی سکتا ہے۔ ایسے میں اسے کیا سوجھ سکتی تھی۔ اپنے بیٹا بیٹی کو اپنے ایک بھائی کے حوالے کر کے اس نے اس جگ سے تیاگ لے لیا۔ اس کی فلسفیانہ سوچ نے اسکو بتایا۔ "دکھ منش کے شریر میں نہیں رہتا' دکھ اس دنیا میں رہتا ہے۔ دکھ دور کرنا ہو تو دنیا کو دور کر دو۔"

اس نے بن باس لے لیا۔ بن باس کا وشیش ارتھ یہی ہے کہ اپنے شریر کو آتما کے اس استھان پر پہونچا دو جہاں نہ دکھ ہوتا ہے نہ سکھ۔ وہاں صرف ایک روشنی ہوتی ہو۔

جب اس روشنی کی تلاش میں اس نے سولہ ۱۶ برس کا بن باس کاٹ لیا تو ایک بات اسے گیان پراپت ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا اسکی کٹیا میں اندھیرا ہے۔ اس کے اطراف اندھیرا ہے سارے بن میں اندھیرا ہے لیکن اس نے آنکھیں بند کیں تو اسے اپنے اندر ہر طرف روشنی نظر آئی ـــ وہ اپنے وجود کے اندر اپنے آپ کو پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ اسکے اندر کیا کچھ ہے اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا وہی سچ ہے اور باقی سب کچھ جھوٹ ـ اسے ایک خوشی مل گئی۔ اس کی تپسیا سپھل ہو گئی یہی وہ روشنی تھی جو اسے دوبارہ دنیا کی طرف لے آئی اور اس نے ایک نئی نظر سے اس دنیا کی طرف دیکھا۔ اپنی بستی کے قریب پہونچ کر ایک پیڑ تلے بیٹھ گیا اور جب ساری بستی والے لوگ وہاں جمع ہو گئے تو اس نے یہ اعلان کیا۔

"میں آج کا گوتم ہوں۔"

"صدیوں کی تپسیا کے بعد اس پیاسی آتما کو پھر ایک بار روشنی ملی ہے۔"

"اس نے اپدیش دیا۔"

(۱۴)

رکمنی کا چچا اس علاقے کا مشہور رقاص تھا اور قریب کی کسی ریاست کے رجواڑے کے دربار تک اس کی رسائی تھی۔ رکمنی اسکے پاس پل کر جوان ہوتی تھی۔ رکمنی کا بھائی اُسی رجواڑے کی چھوٹی سی فوج میں ملازم ہو گیا تھا اور اپنی بستی چھوڑ چکا تھا۔

رکمنی نے بچپن ہی سے رقص و سرود کی رنگا رنگ محفلیں دیکھی تھیں۔ طبلے کی تھاپ اور مردنگ کی تھرک نے اس کے ننھے دل کو ایک سُر تال پہ دھڑکنا سکھا دیا تھا اور دوسرے سازوں سے نکلنے والے سُروں نے اُسکی اُٹھتی ہوئی جوانی کی بھاری سانسوں میں ایک سرگم پیدا کر دیا تھا۔ اب اُسکی چھلکتی چھلکتی جوانی کو شاید ہی گھر کی بندشیں چھو سکتی تھیں۔ اس کے اپنے احساسات کی چو دیواری کے باہر اُس کے بہت ہی قریب سے ہو کر گذرنے والے لمحے اُس سے کہتے رہتے "دیکھو! زندگی ہم ہیں۔ تم جس چو دیواری میں اپنے آپکو محفوظ سمجھ رہی ہے۔ اس میں زندگی نہیں۔ زندگی کے سائے رہتے ہیں۔ تم تو اُٹھتی جوانی ہو، زندگی کی تنی ہوئی کمان، تیر کی طرح اُدھر سے نکل پڑو۔ جس سنگیت کی طرح تمھاری جوانی پھوٹ رہی ہے، اس کا کوئی احساس کوئی جذبہ کسی مجبوری یا کسی بندش کو برداشت نہیں کر سکے گا کیونکہ۔ کیونکہ تم فنکار ہو۔ تم اپنے ردم ردم میں چمکتی ہوئی بجلی کی سی جو بے تابی بار بار محسوس کرتی ہو وہ صرف ان لمحوں کی تھپک ہے جو تمھارے مبہم مبہم احساسات کی چو دیواری سے لگے لگے گذر رہے ہیں اور ہر گھڑی تم کو باخبر کر رہے ہیں۔ وہاں پل ہے، یہی لمحہ ہے، یہی وقت ہے۔ آ جاؤ۔ بچ جاؤ۔ ورنہ تمھارا سارا ماحول تمھارے وجود کے ہر گوشہ پر قابض ہو جائے گا۔ تمھارے ہر احساس اور ہر جذبہ پہ خوف کا ایک بوجھ رکھ

دے گا اور ایک قانون تم اُس چہار دیواری میں محفوظ کر دے گا محبوس کر دے گا۔ بھاگ نکلو، بھاگ نکلو۔ تم اُٹھتی جوانی ہو۔ نکھرتا ہوا فن ہو۔ جوانی اور فن، ان دونوں کی بقا ایک لذت آزاد پر منحصر ہے۔ جو ہمارے پاس ہے۔ زندگی ہم ہیں۔ ہمارے پاس آجاؤ۔۔۔"

رقص و سرود کی اُن رنگا رنگ محفلوں میں آنے والے کتنے ہی رقاص تھے سنگیت کار تھے۔ رکمنی نے اُن میں سے ایک کلاکار کو چُن لیا۔ اور دھیرے دھیرے اپنی ساری تنہائیاں اس کے حوالے کر دیں۔ اسے اپنی تنہائیوں میں بلا یا۔ اس کا نام تھا شیام۔

شیام اُس کی تنہائیوں میں اس طرح آگیا تھا جیسے خواب میں کوئی آجاتا ہے۔ رکمنی نے اُس سے سنگیت سیکھا۔ اُس کے چرن چھوئے۔

ایک بار پتہ نہیں کونسا سُر چھڑا ہوا تھا، کیا عالم تھا۔ رکمنی نے شیام سے بڑے ہی میٹھے اور کھوئے ہوئے انداز میں کہہ دیا۔

"میں کیوں کوئی سنگیت سیکھوں؟ میں تو خود ہی سنگیت ہوں۔ بس ذرا چھیڑ دو یہ سنگیت ساری فضا میں بکھر جائے گا۔"

اس بات پر شیام اپنی آنکھوں سے ہنس پڑا۔ اُس کے سرخ و سفید صحت مند چہرے پر کسی روشنی کا عکس نظر آیا۔ اُس کے اپنے وجود کے اندر ایک جھنکار محسوس ہوئی۔ شیام نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"میں بھٹک رہا تھا، آج تم نے راہ دکھا دی۔"

رکمنی نے اپنی پلکیں اس طرح جھکا لیں جیسے کہہ رہی ہو۔ "جب راہ سامنے ہے تو بڑھتے کیوں نہیں۔؟"

شیام نے رکمنی کو اس طرح دیکھا جیسے اپنی آنکھوں سے اُس کے سارے وجود کو پی رہا ہو۔ اُس نے اس وقت کیا کچھ نہیں دیکھا۔ رکمنی کے سارے چہرے پر معصومیت فن کا

اظہار تھا۔ جبیں سے شانِ حیات آشکار تھی۔ ابروؤں میں وقارِ شباب تھا۔ آنکھوں میں غرورِ فن کی چمک تھی۔ ہونٹوں کی ٹھنڈکوں میں زلف کی آوارگی تھی۔ سرخ و سنہرے جسم کے کھلے ہوئے حصّوں کو دہکتی نظروں کے لمس کا انتظار تھا۔ سرتا بہ قدم ہر موڑ پر اندازِ رہبری تھا۔ اندیشۂ رہزنی تھا۔ لیکن ان ساری کیفیتوں کی تہہ میں دبا دبا ایک سیال سا احساس یہ بھی تھا۔ بس ایک سوگ! دُو دِیپہ ابرِ سحری جیسا۔ جانے یہ کیوں تھا؟ یا پھر یہی سب کچھ تھا۔

شیام نے بلا خوف و خطر رُکمنی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ رُکمنی بے سدھ ہو گئی زندگی میں پہلی بار مرد کی یہ قربت، مرد کی آغوش۔ ایک کھلتی انگڑائی کو رُکمنی نے اندر ہی اندر اپنے ہر عضو میں دبا لیا۔ ایک چبھن کے لیے اُسے لگا اس کے ہونٹ نہیں، انگارے ہیں۔ اُسے یقین ہو گیا یہ انگارے اور دہک اُٹھیں گے۔ اور اس کا سارا بدن آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

شیام بھی دہک رہا تھا۔ لیکن اُس نے ذرا سنبھل کر پوچھا "کیا سچ مچ تم مجھ سے پریم کرتی ہو"

"پریم!" کانپتی آواز میں یہ لفظ دہراتے ہوئے رُکمنی چونک پڑی۔ اچانک شیام سے الگ ہو گئی۔ ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ اور سہمے سہمے کہنے لگی۔

..."پتہ نہیں کیوں — مجھے معلوم نہیں۔ تمہاری اس بات پر مجھے ایسا لگا جیسے تم نے میرے گلاو کے اندر اپنے ناخن دھنسا دیئے۔ مجھے نہیں معلوم کیوں مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" جیسے وہ اپنے آپ سے کچھ ڈر گئی تھی۔ وہ تڑپ کر پرے ہٹ گئی اور اپنے قریب رکھا ہوا ستار اٹھا لیا۔

"شیام، تم اب کچھ نہ کہو۔ جی چاہتا ہے ایک ایسا نیا راگ نکل آئے اس ساز سے جو میرے بدن میں لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ ایسا راگ ایک بار بجا لوں تو

ہیں... میں اور میری کلا امر ہو جائیں گے... تم چپ رہنا۔"

رُکمنی نے دھیرے دھیرے اپنا ساز چھیڑ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

اس طرح روز بروز ساز و سنگیت کی گہرائیاں بڑھتی رہیں اور ان گہرائیوں میں رُکمنی اور شیام ڈوبتے گئے۔ لیکن شیام رُکمنی کی ان اتھاہ گہرائیوں تک بہ مشکل پہونچ پاتا جہاں پہونچ کر رُکمنی اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتی اور اس سے بھری ہوا اتنی باتیں کہنے لگتی۔ لگتا تھا کہ نہ صرف اُس کی زبان بلکہ اُس کے بدن کا ہر حصّہ بول رہا ہے۔

ایک دن اُسی طرح رُکمنی نے شیام سے کہا۔ "شیام تم صرف ایک کلاکار ہو۔ انسان نہیں ہو۔ اسی لیے تم نہیں جان سکے کہ میں کیا بول رہی ہوں!"

شیام نے مسکرا کر کہا۔ "میں سب جانتا ہوں۔"

"جانتے ہو تو پھر سمجھ کیوں نہیں لیتے؟" رُکمنی نے کہنا شروع کیا۔ "گھڑیاں گھنٹوں میں بدل گئیں۔ گھنٹے دنوں میں۔ دن مہینوں میں۔ اب ایک ایک پل، ایک ایک دن لگتا ہے اور دن ایک ایک مہینہ۔ میں صرف راہ دیکھ رہی ہوں۔ صرف انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لگتا ہے تم مجھ تک پہونچ جاؤ گے۔ مجھ سے ہو کر گزر جاؤ گے۔ تو کبھی شاید میں انتظار ہی کرتی رہوں گی۔ جی چاہتا ہے آگے ہی آگے دیکھتی رہوں۔ آنے والے سارے لمحات مجھ سے لپٹ جائیں۔ چمٹ جائیں۔ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوں۔ یہ وہی لمحے ہیں جو مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ اِدھر آجاؤ۔ ہماری طرف۔ زندگی ہم ہی سے"

یہ ساری باتیں سُن کر شیام نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم ایک مہان کلاکار ہو۔"

رُکمنی کی فنکارانہ فطرت سے ایک مترنم ہنسی پھوٹ پڑی۔ رُکمنی نے کہا۔

"شیام اگر میں ایک مہان کلاکار ہوں تو میں ایک مہان عورت بھی ہوں۔ تم وہ پہلا مرد ہو جو میرے اتنے قریب آئے ہو۔ اس سے پہلے بھی جب تم میری سانسوں میں اُلجھ گئے

ہو تو تجھے یہ ہوش نہیں رہتا کہ میں تم سے کیا کچھ کہہ رہی ہوں۔ مگر یہ سب کچھ کہنے سے مجھے ایک عجیب لذت محسوس ہوتی ہے۔ دیکھو ایک نشہ سا آ رہا ہے۔ بس تم سمجھ جاؤ۔ سمجھ جاؤ گے نا؟ پھر تم مجھے بتانا میں نے کیا کچھ کہا ہے۔"

جب تمھاری زبان سے میری خواہش کا اظہار ہو گا نا۔ تو میں تم سے کہوں گی۔ تم سے بنتی کروں گی کہ ذرا مجھے اس دھرتی سے اٹھا کر ہواؤں میں لے چلو۔ جی کا ارمان یہی ہے کہ ہم دونوں بے قابو ہو کر ہواؤں میں اڑنے لگ جائیں۔ پھر تم مجھے اپنے سارے بدن سے اس طرح لگا لینا کہ تم سارے کے سارے میرے اندر تحلیل ہوتے چلے جاؤ۔ جذب ہوتے چلے جاؤ۔ اور پھر مستیوں میں تر بتر میرے جسم کے ہر ریشہ سے ایک نئے سنگیت کے میٹھے سُر نکلتے چلے جائیں اور فضا میں بکھرتے چلے جائیں۔ میں کلاکار ہوں نا؟ میری کلا جانے کن بلندیوں پہ پہونچ جائے گی۔ اونچی ہی اونچی۔ کلاکار کو تو کھلی سر مئی فضائیں چاہئیں۔ گنگناتی ٹھنڈی ہوائیں چاہئیں، آسمانی بلندیاں چاہئیں۔ مہکتی شاداب روش سیدھی اک ڈگر چاہیئے۔ رنگ برنگے اور انوکھے نگر چاہئیں۔ اُن نگروں میں بسنے والی ہنستی کھیلتی زندگی چاہیئے۔ پھر خود فراموشیوں اور مدہوشیوں میں کھوئے ہوئے فنکار کی ہر خواہش اور ہر کامنا کو آزادی چاہیئے جو حیات و فن کی لذت اور اُس کے نکھار کا شاہکار ہو۔ چلو، مجھے اُن بلندیوں پہ لے چلو۔ چلو نا؟۔ پھر میں تمھاری پُرسکون آغوش میں واپس اس دھرتی پہ اُتر آؤں گی تو میرا انگ انگ ایک خواب آور تھکن کے نشہ سے سرشار ہو جائے گا پھر میں تمھارے ہی تصور کو اپنی آنکھوں سے لگا کر سو جاؤں گی اور یہ ساری دھرتی میرے لیے پریوں کا دیش بن جائے گی۔ بس یہی میں ہوں، یہی میری کلا ہے۔"

شیام نے اپنے دونوں ہاتھوں میں رنجنی کے چہرے کو کھلی کتاب کی طرح تھام لیا اور کچھ ایسی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا جیسے اُس چہرے کی دمکتی سرخیوں میں ابھرنے

والے ہر جذبہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن شاید وہ اُس چہرے کو پڑھ نہ سکا۔ اُس نے آگے بڑھ کر رکمنی کے پیاسے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ رکمنی کو اپنے سینے میں چھپا لیا اور بڑے ہی کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"تم کو پاکر میں اپنے آپ کو ایک بڑا ہی مہان کلاکار سمجھنے لگا ہوں۔ تمھاری ساری بپتا سُن کر آج ایک بڑی ہی اچھی بات یاد آ گئی ——— سنوگی ؟"

"ہوں ۔" رکمنی اُس کی آغوش میں کچھ پھیل گئی اور پُر اشتیاق نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ شیام نے کہنا شروع کیا۔

"ایک زمانہ گذر گیا۔ اس دیش میں ایک بہت ہی خوبصورت شہزادی رہتی تھی۔ محل کی ساری آسائشیں اسارے عیش اُسے میسر ہونے کے باوجود وہ ہر پل بے کل و بے قرار رہتی تھی۔ ایک ہیجان میں مبتلا رہتی تھی۔ سنگیت اُس کا مزاج تھا۔ تخت و تاج جاہ و حشمت سب کچھ اُس کے پاس ہیچ تھے۔ فن کی بلندیوں پہ اُسکی نظر تھی۔ اُس کی بے تابیوں میں چھپا ہوا اُس کا فن تھا۔ اُس کی روح کی بے قراریوں میں سنگیت کا گداز تھا اور اُس کی تنہائیوں پہ اُس کا اپنا راج تھا۔

ہر رات وہ اپنی خوابگاہ کے سارے دریچے کھول دیتی اور آسمانوں پر دُور دُور تک کچھ ڈھونڈنے لگتی۔ لیکن جب بے چینیاں بڑھ جاتیں تو وہ دوڑ کر آئینہ کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پھر جیسے اپنے حسن و شباب کو دیکھ کر اپنے آپ پر فریفتہ ہو جاتی۔ پھر جیسے اُس کے سینے میں ایک آگ سی بھڑک اُٹھتی۔ ایک خواہش اُس کے سینے میں دہکنے لگتی کہ آئینے میں اُس کے عکس سے کوئی لپٹ جائے اور وہ اپنی آنکھوں سے وہ نظارہ دیکھتی رہے۔ پھر اُس کے عکس کو کوئی زور، زور سے بھینچنے لگ جائے، وہ دیکھتی رہے۔ اور کوئی اُس کے اندر سماتا چلا جائے، وہ دیکھتی رہے۔ ایک آگ کا شعلہ لپکتا رہے ... بس وہ دیکھتی رہے۔

لیکن جب ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے بدن کی اُس تپش سے مجبور ہو کر دیوانہ وار

اُن کھلے دریچوں کے پاس جا کر باہر جھانکنے لگتی تھی۔ کبھی ایسے ہوا کا ایسا سرد جھونکا آجاتا کہ
کہ شمعیں گل ہو جائیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ دریچوں سے ہٹ آتی اور خوابگاہ
کے فرش پر لوٹ جاتی۔ اور پھر اپنے کسی شدید جذبے کے اظہار کے لئے اپنا
سارا ستار نوچ پھینکتی۔ ایسے میں جب وہ اپنی سلگتی عریانیوں کو چھو لیتی تو اس
کے منہ سے ایک آہ نکل جاتی جیسے چرکہ لگ گیا ہو۔ وہ جان چکی تھی کہ یہ آگ
نہ وہ سنگیت ہے جو اس کی نس نس میں بسا ہوا ہے نہ اس کے تن کی تب و
تاب ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ دراصل ایک فن کار کی رگوں میں بہنے والے خون کا
سیلاب ہے۔ یہ ایک فنکار کا آتش فشاں جیسا شباب ہے جو پھوٹ پڑنے کو
ہے۔ اس طرح جب وہ اپنی اس کیفیت میں کھو جاتی تو وارفتگی میں اپنا ساز اٹھا
لیتی اور جب اس کا سنگیت ساری فضاؤں میں بکھرنے لگتا تو اچانک کوئی خیالی
شہزادہ اُن کھلے دریچوں سے اس کی خوابگاہ میں آ جاتا۔ اس کے قریب آ کر اس کے
شانوں پہ اپنا سر رکھ دیتا۔ اس سے لپٹ جاتا۔ اس کے سارے بدن کو چومنے لگ جاتا
اس کو اپنے سینے میں سمیٹ لیتا۔ اور اس نرم گرم خوابگاہ کی رنگینیوں میں مدہوشیوں
میں ساری رات گزر جاتی۔ صبح سے پہلے انہی دریچوں سے شہزادہ فضاؤں میں اُڑ
جاتا اور شہزادی ایک نشہ آور تھکن سے سرشار سو جاتی۔ آج کے سنگیت
اتہاس میں اس سنگیت کی شہزادی کا بڑا مان ہے اور آج بھی اس کی گن گان ہے۔

یہ مختصر سی داستان سنا کر رکمنی نے بڑے ہی نشیلے انداز میں کہا "شیام وہ
شہزادی آج تمہارے سامنے ہے۔ جانتے ہو میں اسی کا ایک جنم ہوں۔ کیا کسی
شہزادی سے کم ہوں شیام؟ ویسے ایک کلاکار کے مقابلہ میں ایک شہزادی کی کیا
حقیقت ہوگی۔ محل تو میرے پاس بھی ہے۔ بہت ہی عالیشان بادلوں میں اُڑتا ہوا
رنگوں سے روشن کیا ہوا۔ کل ہم اسی محل میں رہیں گے۔ جانے کیوں بار بار دل

اس خیال پہ بُری طرح مچل جاتا ہے کہ میں اس زمین سے کچھ الگ ہو جاؤں یا ... یا پھر جنگل میں جا کر بس جاؤں۔ بڑی ہنسی آتی ہے اپنے اس خیال پہ۔ لیکن جی کا یہ ارمان بڑا سخت جان ہے — چلو نا، چل کر کبھی جنگل میں رہیں —

"بڑا ارمان ہے کہ ہم خطروں میں گھر جائیں۔ تم اپنی دیوتا کے ساتھ اُن سارے خطروں سے لڑنا تو میں تم پہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دوں گی۔ آہ کیا گھڑی ہوگی وہ۔ جنگل کے پھل پات کھائیں گے۔ کھلی ہوا میں رہیں گے۔ تم بھی جیسے سنت بن جاؤ گے اور میں ایک تیز و طرار دھارا۔ تم سے ٹکرا کر بھنور ڈالا۔ میں کتنے زور سے چیخ پڑوں گی جب اچانک میرے سامنے کوئی وحشی جانور آ جائے گا۔ تم فوراً اس پہ حملہ کر دو گے اور مجھے بچا لو گے تو میں اپنی یہ دھرتی — سارا آکاش تم پر سو سو بار قربان کر دوں گی — چلو نا؟ کرو وعدہ — بولو"

یہ ساری باتیں سنتے ہوئے شیام رُکمنی کو گھورے جا رہا تھا۔ اسے کوئی فوراً جواب سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس نے یونہی اپنے جواب کو بامعنی بنانے کے لیے مُسکرا دیا اور بولا۔

"مجھے یقین ہو گیا ہے۔ تم سچ مچ اسی شہزادی کی بے چین آتما ہو۔ آج وہی آتما تمھارے شریر کو پکار رہی ہے، سُلگا رہی ہے، تمھاری آتما، تمھاری کلا ہے۔ تم بھی جہاں ہو۔ دھیرج رکھو تم جہاں چاہو گی ہم وہاں چلے جائیں گے۔"

"لیکن کب؟؟" بڑی ہی بے چینی سے رُکمنی نے پوچھا۔

"تم جب چاہو"

"اوہ!!" رُکمنی خوشی سے چیخ پڑی اور شیام کے سینے سے لپٹ گئی۔ "تم کتنے ویر ہو، بہادر ہو، تم صرف میرے ہو۔ بولو تمھیں کیا چاہیے؟"

شیام نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ "مجھے جو کچھ

چاہیئے، وہ سب میرے قبضہ میں ہے۔"

"سچ!!" رُکمنی کے چہرے کے رنگ اور نکھر گئے۔

"ہاں۔" کہتے ہوئے جانے کیوں شیام خلاؤں میں دیکھنے لگا۔

"یہ کیا؟ تم کچھ سوچنے لگے؟" رُکمنی نے اپنی بوجھل پلکوں کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔ سچ سچ بتاؤ ہم کب جائیں گے جنگل کی طرف! میں چاہتی ہوں آج ہی رات ہم نکل چلیں۔ جب آدھی رات گذر جائے تو تم اپنی تیاری کے ساتھ گلی میں آ جانا۔ میں بھی اپنے من پاس کی تیاری کر لوں گی اور باہر دروازے کے پاس ہی تمھاری راہ تکتی رہوں گی۔ آج کی رات، ہاں؟؟"

جواب میں شیام نے والہانہ انداز میں رُکمنی کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ اور اُس کی آنکھوں، اُس کے ہونٹوں اور باہوں پہ بوسوں کی بوچھار شروع کر دی۔ رُکمنی کسمائی۔ پھر تڑپ کر اس سے اور سمٹ گئی۔ لیکن ساتھ ہی شیام کے بوسوں کو روکتے ہوئے بولی۔

"ٹھہرو شیام ٹھہرو۔ دیکھو اب یہ سب کچھ جنگل میں۔ اپنی کٹیا میں۔ باہر نرم نرم گھانس پر لیٹے ہوئے سوکھے پتوں پہ آزادی سے لوٹتے ہوئے۔ جھرنوں کے بہتے ہوئے پانی میں نہاتے ہوئے — ہائے وہ منظر۔ چلو اب تم جاؤ اور پوری تیاری کر لو۔" یہ کہکر اُس نے خود شیام کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اس کی باہوں سے الگ ہو گئی۔ "چلو جاؤ یہاں سے اب — جاؤ نا!"

شیام مسکراتے ہوئے وہاں سے اُٹھا۔ اور باہر چلا گیا۔ رُکمنی اُسے کچھ اس طرح اپنی ہنستی آنکھوں سے دیکھتی رہی جیسے وہ جا نہیں رہا تھا بلکہ آ رہا تھا۔

~~~
~~~

(۱۵)

رات کا نصف اول بھی اپنی جگہ ایک مکمل گیت ہوتا ہے۔ مکمل گیت وہی تو ہوتا ہے جو تشنہ ہو۔ جس کے بولوں میں میٹھے میٹھے درد کا تبسم ہو۔ وہ ایسے کسی گیت کے بول ہوں یا آدھی رات کے لمحات، ایسی کھلتی کلیوں کی تشنگی لیئے ہوئے ہوتے ہیں جو صرف شبنم سے بجھائی جاتی ہو۔ اُس آدھی رات کا ہر دہکتا لمحہ دوسرے لمحے سے کچھ اس والہانہ انداز میں چمٹا جاتا ہے جیسے گذرتی رات پھولوں کے ہار پرو رہی ہو اور اُس تشنگی کی تہہ میں گُھد بُد ہونے والے ارمان بڑے ہی خوبصورت گلدستے بن رہے ہوں۔ یہ ہار، یہ گلدستے کس کے لیے ہوتے ہیں؟ ارمانوں بھری رات کی ہر سانس ایک دہکتی آس ہوتی ہے۔

لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ یہی آس دھیرے دھیرے ایک ایسا تیز اور چمکدار لمحہ بن جاتی ہے جو رات کے بدن کو دو حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اور آدھی رات گذر جاتی ہے۔

رُکمنی اپنے گھر کے بیرونی دروازے پر اس طرح دم سادھے کھڑی ہوئی تھی کہ اُس کے سارے ہوش و حواس دروازے سے باہر گلی کے راستہ پہ بچھ گئے تھے کہ کہیں دُور بھی کوئی آہٹ ہو تو وہ جاگ جائیں۔ چونک پڑیں۔ اور پل بھر میں اندر جا کر رُکمنی کو خبر کر دیں۔

سارا گاؤں یا تو رُکمنی کے ارادوں سے واقف ہو چکا تھا اور دم سادھے ہوئے چپ چاپ رُکمنی کی طرف نگراں تھا یا پھر سارا گاؤں سو چکا تھا۔ رُکمنی سے بے خبر تھا۔ رُکمنی کے گھر والے تو کچھ اتنے زیادہ بے خبر تھے گویا بھول چکے ہوں کہ

رُکمنی جیسا پرآشوب سناٹا بھی کوئی وجود رکھتا ہے۔ رُکمنی بھول چکی تھی کہ اُس کے پاؤں ابھی زمین پر ہی ہیں اور وہ ایک بھری پُری بستی میں ابھی بسی ہوئی ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے دُور تک پھیلا ہوا گلی کا اندھیرا تھا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ نہ صرف دھرتی بلکہ پورا آکاش بھی اس اندھیرے کے شکنجے میں آ جائے۔ کسی کو کچھ دکھائی نہ دے کسی کو کچھ سُنائی نہ دے اور صرف وہ سُن سکے دبے پاؤں دوڑنے والے گھوڑے کی آواز۔ پھر اُس آواز کو وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں اس طرح جذب کر لے کہ سوائے اُس کے کسی اور کو وہ سُنائی نہ دے۔ ٹپ، ٹپ، ٹپ۔۔۔ ٹپ، ٹپ ٹپ۔۔۔

تاریک گلی سے بار بار یہی صدا سُنائی دیتی تھی اور پھر اس سناٹے میں کچھ لہریں پیدا کر کے، سناٹے کی گرد میں دھنس جاتی تھی۔ ٹپ، ٹپ، ٹپ۔۔۔ کتنی قریب ہے یہ آواز اور وہ تارے کتنی دور ہیں جن کی روشنی میں وہ اس آواز کی شکل دیکھنا چاہتی ہے۔ قریب آ کر بھی وہ آواز نہ دکھائی دیتی ہے نہ ٹھیک سے سُنائی دیتی ہے۔ رُکمنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے گلی کے اندھیرے نے اور سناٹے نے اُس کے خلاف کوئی سازش کر لی ہو اور اب دونوں بے وجہ اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ قریب آ پہنچے ہیں۔

رُکمنی اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے ایک بار واپس دروازے کے اندر گئی اور کواڑ بھیڑ دیئے، سوچنے کی کوشش کی اور سوچنے میں کامیاب ہو گئی کہ رات کتنی گذر گئی ہے۔ رات تو اپنے بچپن سے گذر گئی تھی جبکہ اُس نے بڑی طرح شرارت سے رُکمنی کے ارمانوں کو گدگدایا تھا۔ اُس سے آگے رات اپنے لڑکپن سے بھی گذر گئی تھی جب کہ ارمان ہی ارمان تھے ہرے ہرے تر و تازہ پھول جیسے۔ یقین ہی یقین تھے۔۔۔ اور اب تو لڑکپن سے بھی گذر کر رات بالکل جوان سی لگتی ہے۔ یہ کیسی عمر ہے کہ کچھ اندیشے اُس کے حسین و جمیل یقینوں کا طواف

کرنے لگے ہیں۔ لیکن یقین پھر بھی یقین ہے۔ رات جوان ہے اور جوان رات کا اندھیرا ابھی جوان ہے سناٹا بھی جوان ہے اور ان سے ہو کر یہاں پہونچنے والا بھی جوان ہے۔

رکمنی کو یقین ہو گیا کہ اندھیروں اور سناٹوں میں جو سازش ہو رہی ہے۔ اس میں وہ خود بھی شریک ہے۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں۔ اس نے پھر ایک بار دروازہ کھولا۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہ اب ٹاپوں کی صرف آواز ہی نہیں آئے گی بلکہ گھوڑا بھی آئے گا۔ صرف گھوڑا ہی نہیں آئے گا۔ سوار بھی آئے گا اور وہ سوار ہوگا شیام۔ کوئی شکایت نہ کروں گی۔ کوئی بات نہ کروں گی۔ اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤں گی اور دبی آواز میں صرف اتنا کہوں گی۔ "چلو"۔ اور پھر ہم پل بھر میں نکل جائیں گے "ان بے خبر انسانوں کی بستی سے دور، رات بھر بھاگتے ہوئے جنگل کی طرف۔ چلتے چلتے دوڑتے دوڑتے ہم تھک جائیں گے اگر جائیں گے کسی کھردری، ناہموار جگہ پر اور ایک دوسرے سے لپٹ کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ پھر وحشیوں کی آواز سے ڈر ڈر کر اپنے آپ کو ایک دوسرے کو قریب اور محفوظ کرتے چلے جائیں گے اور صبح کر لیں گے۔ اور پھر زندگی کی وہ پہلی صبح۔

رکمنی کے ان خیالات کی رفتار کے ساتھ رات کی جوانی گذر رہی تھی۔ اور یقینوں کے اطراف طواف کرنے والے اندیشے برابر ایک گھیرا بنائے جا رہے تھے۔ اور وہ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

جب آدھی رات گذر جاتی ہے تو یقینوں کی بھی آدھی عمر کٹ جاتی ہے۔ یقینوں کا رنگ بدلنے لگتی ہے۔ رات کی گہری سیاہیوں کے ساتھ، اور جب سارے یقین ان سیاہیوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں تو رات کا چمکتا چہرہ بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور صرف آدھی رات باقی رہ جاتی ہے جس کے اندھیروں کو مشکل

سے کوئی پھر اندازہ لگا سکتا ہے۔ مشکل سے کوئی اُن پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ ہوائیں کانا پھوسی کرنا شروع کر دیتی ہیں اور ہر اُس پاس پھیلنے لگتی ہے۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا۔" رکمنی نے سوچا۔ "ابھی ابھی لمحے ہی تو آئی ہے شباب پہ رات۔ یہی تو لمحات وصال ہوتے ہیں۔ انہی مرہون منت کتنی ہوشربا داستانیں ہیں۔ اور اب میری ایک داستان رنگین شروع ہونے والی ہے۔ ابھی لمحات ہیں۔ انہی لمحات میں کہ۔۔۔۔ ایک شہزادی تھی۔۔۔۔ اپنے دل کی۔۔۔۔ اور اُس کے دل کا ایک شہزادہ تھا۔"

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ جو تر و تازہ خوشبوؤں میں بسا بسا لگتا تھا جیسے اس شہزادے کے بدن کے پسینے کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے آیا ہو۔ رکمنی نے کلائی سے ہوئے یقین یکبارگی مہک اُٹھے۔ اُس کے سارے وجود کو خوشبوؤں نے لپیٹ لیا۔ "دل کی دھڑکنیں اس طرح گونجنے لگیں تو گھوڑے کی ٹاپ کیسے سنائی دے؟" لیکن اس دل پر بھی تو وہی شہزادہ سوار ہے۔ وہی آ رہا ہے۔ اس دل کو دوڑاتے ہوئے۔ یہ دھڑکن نہیں گھوڑے کی ٹاپ ہے۔ کتنا تیز دوڑتا ہوا آ رہا ہے یہ شہسوار۔ اب تو سر تا پا میں ایک دھڑکن بن گئی ہوں۔ اف یہ دھڑکن! یہ گھوڑے کی ٹاپ۔ ساری گلی گونج رہی ہے۔ سب گلی والے جاگ جائیں گے۔ اب کیا ہوگا۔ رکمنی نے آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے اب وہ اپنے کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے سن رہی ہے۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ سرپٹ دوڑتا ہوا کوئی گھوڑا آ کر رکمنی کے قریب اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کہ سوار نے اچانک پوری قوت سے لگام کھینچ لی ہو اور گھوڑا الف ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی رکمنی کے دل کی دھڑکن بھی اچانک رک گئی۔ پھر ایک لمحے کے لیے ایک ایسا سکوت چھا گیا۔ جیسے رکمنی اگر کچھ کہے تو اس کی آواز آسمانوں تک چلی جائے۔ جبھر

تبھی اُس نے بنا آنکھیں کھولے راز دارانہ لہجے میں کہا ”شیام!“
کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اپنے یقین کو اپنی بند آنکھوں میں سنبھالے ہوئے اُس نے کہا۔ ”شیام“
پھر بھی کوئی جواب آیا نہ اُس کا سوال لوٹا۔ اُس نے کچھ اس طرح احتیاط اور ہمت سے اپنی پلکوں کو دھیرے دھیرے اُٹھانا شروع کیا جیسے اُن پر ساری رات کا بوجھ آن پڑا ہو۔ گلی میں گہرا اندھیرا تھا۔ لیکن اُسے ایسا لگا کہ اُس کی آنکھوں سے روشنی چھوٹنے لگی ہے۔ اُس روشنی میں اُسے جو کچھ نظر آیا وہ کچھ ایسا تھا۔ جیسے کوئی گہرا سیاہ بادل اُس کی خیالی شکل میں ڈھل گیا ہو۔ یک کہ وہ اُس شکل کی طرف بڑھ گئی اور اس طرح اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے کہ اُن میں کوئی سرد اور سخت شئے آگئی اُس نے اس شئے کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ گھوڑے کی رکاب تھی۔ رکاب اُس کے ہاتھوں میں آتے ہی اُس کے سارے بدن میں ایک قوت دوڑ گئی۔ رکاب میں رکھے ہوئے سوار کے پیر سے وہ لپٹ کر جھوم گئی۔ اُس کی زبان سے نکل پڑا ”شیام، تم آگئے“۔ اُس کی اس بات پر گھوڑے کے سارے جسم پر ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس بار رکمنی نے اپنی آواز میں ایک ہلکا سا سنگیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟ میرے لیے بھی تو جگہ بنا دو، اس رکاب میں۔“
لیکن جب رکاب میں رکھے ہوئے سوار کے پیر میں کوئی جنبش ہوئی نہ اُسے کوئی جواب ہی ملا تو رکاب کے ٹھنڈے لوہے کا لمس یکلخت ایک خنجر کی دھار بن گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے ہاتھ سے خون ٹپک پڑا ہو۔ جیسے ہی رکمنی نے رکاب کو چھوڑا، سوار نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ رکمنی نے آنکھیں اُٹھائیں۔ عین اُس لمحہ اُسے لگا کہ وہ گہرا سیاہ بادل گرج اُٹھا ہو اور اُس میں ایک بجلی سی چمک گئی ہو۔ رکمنی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ ”نہیں۔“

اِس بار بادل کی گرج بھی دھیمی پڑ گئی۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔"

"لیکن۔ نہیں۔۔۔۔ ایسا نہیں۔" رُکمنی کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"میں تمھاری مدد کروں گا۔ میں نے تمھارا ہاتھ تھام لیا ہے۔ یہ ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دو۔"

"نہیں میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ مجھے تمھاری مدد نہیں چاہیئے۔"

"دیوی جی۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں ایک مرد ہوں۔"

رُکمنی کے ٹھنڈے خون میں جیسے یہاں وہاں چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ پلکوں کی نمی کا احساس ہو گیا۔ اُس احساس نے اُسے تھوڑی بہت قوت بخش دی۔ اُسے اپنے آپ پر کچھ قابو آ گیا۔ اور بدن میں سلگنے والی چنگاریوں نے خون کو کچھ گرما دیا۔ اپنی بھیگی بھیگی آواز کو کچھ خشک کرتے ہوئے رُکمنی نے کہا۔

"اگر تم سچے مرد ہو تو میرا ہاتھ چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بھی ایک عورت ہوں۔ لیکن میری یہ بھی بات سُنتے جاؤ۔ اگر شیام آج صبح تک نہیں آیا تو کل تم آدھی رات گئے یہاں آنا۔ میں تمھیں یہاں ملوں گی۔ اگر نہ ملوں تو یقین کر لینا کہ شیام صبح سے پہلے آ گیا تھا۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور چلے جاؤ۔ میں نے اِس اندھیروں میں بھی تمھیں دیکھ لیا ہے۔"

سوار نے کہا۔ "میرا نام راجہ ہے۔"

"ہو گا۔" رُکمنی نے کہا۔ مجھے کل بتانا۔ سوار کو ہلکی سی ہنسی آ گئی اُس نے رُکمنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا۔

"تم کو معلوم ہو گا گاؤں گیان کا کتنا بڑا میلہ ہوتا ہے ہر سال۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ صبح تک پہنچ جاؤں گا۔ ساتھ ہو لو۔ میلہ کی سیر ہو جائے گی۔

شام تک لوٹ آئیں گے۔ اور پھر آدھی رات گئے میں پھر تم سے مل لوں گا۔"
اس بات پر رکمنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شاید مسکرا پڑی ہو یا پھر پل
بھر کے لیے اُسے رات کی خُنکی کا احساس ہو گیا ہو۔ اُس نے کہا۔" اب تم چلے جاؤ۔"
راجہ نے اپنے گھوڑے کی لگام تھامی۔ ایڑ لگائی۔ گھوڑا جیسے اچھل پڑا۔

راجہ نے چلتے ہوئے کہا۔
"تم جا رہی ہو۔ کل آدھی رات گئے مجھ سے مل لینا۔ مگر میں تو شام ہی سے
یہاں آ جاؤں گا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور گہرے اندھیروں میں غائب ہو گیا
بس گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز دُور ہوتی جا رہی تھی۔ مدھم ہوتی جا رہی تھی جیسے
رات کے دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی ہوں۔
رکمنی کو اب پوری طرح اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ جس زمین پر وہ کھڑی
ہوئی تھی اُس میں اُس کے پاؤں دھنس گئے ہیں۔ اُس نے اب ایک فرض و احتیاط کے
احساس کے ساتھ ایک نظر اس رُخ پر ڈالی جدھر سے شام آنے والا تھا۔ گلی کی نکڑ سے
بھی آگے، بہت دُور تک پھیلے ہوئے اندھیرے ہی اندھیرے نظر آئے۔ اندھیرے بھی
ایسے جس میں کہیں کوئی آس نہیں ہوتی۔ بس بالکل بے روح و بے جان مُردہ اندھیرے۔
اُس نے بڑی ہی مشکل سے زمین میں دھنسے ہوئے اپنے پاؤں اُٹھانے کی کوشش
کی اور پیروں کے بوجھ سے زیادہ اپنے سر کے بوجھ کو شانوں پر محسوس کرتے ہوئے
وہ اپنے گھر میں واپس آ گئی۔ کھلے کواڑ سے سرگوشی میں کہا۔" پھر بھی میں آخری
آس ہوں۔ مجھے کھلا رہنے دو۔"
رکمنی گھر کے اندر جا کر ڈھیر ہو گئی اور کھلے کواڑ کو تکتی رہی۔ ایسے میں ادھ کھلے کواڑ سے ایک
آدھ ہلکا سا ہوا کا جھونکا گذر جاتا تو پھر اُسے کسی ایسے احساس نے دبوچ لیا جس کا نام ہو سکتا تھا
غم! مایوسی! یا ناکامی ـــ یا پھر زخم آلود نیند ــــــ

(۱۶)

یہ رُکمنی کہہ رہی تھی راجہ سے، بڑے ہی کھلے انداز اور بے باک لہجے میں اور اُس کے ہر لفظ پہ ایک تبسّم کا گمان ہوتا تھا۔

"تم کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔ سُنا ہے۔ لیکن سُننے سے زیادہ تم کو دیکھنا پڑتا ہے۔ عجیب مرد ہو۔ بڑے سخت ہو۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ کسی سے ملنے کی راہ و رسم سے تم ناواقف ہو اور اچھے ہو۔"

راجہ ہنس پڑا اور بولا۔ "سچ!"

"ہاں۔ کل میں تم سے ڈر گئی تھی اور آج دو گھڑی میں تمہاری طرح سینہ سپر ہو گئی ہوں مگر۔ اس طرح بھی بھلا کوئی کسی سے ملتا ہے کہ آنکھ جھپکی اور نظر سنبھلی بھی نہیں کہ سینے کوئی سانسوں سے اُلجھ جائے۔ جاننے پہچاننے کی کوئی تو ریت ہونی چاہئے۔"

یہ بات اُس نے کچھ اس طرح سے کہی جیسے اُس کے سینے میں دبی ہوئی کوئی ہنسی اُبل پڑی ہو۔ پھر اپنی اس ہنسی کو اپنی پلک کے جھین سے پردے میں چھپا کر زیادہ خوب صورت بناتے ہوئے بولی۔ "کہو، میں تمہارے بارے میں کیا کہوں۔ بس اِن دو گھڑیوں میں میں نے تم کو جتنا جانا ہے اُس سے آگے میں تم کو جاننا نہیں چاہتی۔ میں یہیں ٹھہر گئی ہوں۔ اس سے آگے میرے لیے کوئی راستہ نہیں۔ کچھ تو بولو۔"

"میں تو تم کو صرف دیکھے جا رہا ہوں اور یہ سمجھ رہا ہوں کہ تم دراصل صرف میری باتوں کا جواب دے رہی ہو۔"

"اچھا، اگر ایسا ہے تو سُنو۔ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں شیام میرے پاس تھا۔ مگر آج اس گھڑی ایسا لگتا ہے جانے کتنی راتوں سے میں سوئی ہوئی تھی اور ابھی

ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے جگایا ہے اور میں نے جانے کتنی مدت بعد ایک جیتی جاگتی دنیا کو اپنے روم روم میں محسوس کیا۔ تم کون ہو، مجھے نہ بتاؤ۔ بس اتنا بتا دو۔ تمھیں سنگیت پسند ہے؟

"اتنا ہی پسند ہے جتنا تم۔ میرے پاس سنگیت اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔"

"ارے واہ، تم تو بڑے گیانی ہو۔ تو کیا تمھاری اس بات سے میں یہ بھروسہ کر لوں کہ تم مجھے جتنا پسند کروگے اتنا ہی میرے سنگیت کو بھی۔؟

"بالکل۔"

تمھاری ہر بات سے مجھے ایک خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ جو شاید اب ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے وہ سب کچھ دے رہے ہو جس کے لیے ایک شدید خواہش میرے اندر ہمیشہ موجود رہی ہے۔ لیکن میں کبھی اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی اور نہ اس کا اظہار کر سکی۔

اب تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ کیا تم مجھے جاننا چاہتے ہو؟"

"اس بات کی کوشش میں عمر بھر نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ عورت کو جاننے سمجھنے کی کوشش وہ کرتا ہے جو مرد نہیں ہوتا۔"

یکلخت رکمنی زور سے ہنس پڑی اور کچھ دیر بڑی ہی لذت آمیز انداز میں ہنستی رہی۔ اور ہنستے ہنستے ہی پوچھا۔

"تو تمھارا مطلب ہے کہ میں جو بھی ہوں، جیسی بھی ہوں، اچھی ہوں۔"

"تم اچھی ہو یا بری یہ میں نہیں جانتا۔ تم عورت ہو، میں مرد ہوں۔ بس۔"

"بس؟"

"ہاں بس"

"لیکن اتنا تو جان لو کہ سنگیت ہی میری ساری زندگی ہے۔ سنگیت میرے جسم میں، میری روح میں ایک لذت بھر دیتا ہے کہ میرے لیے سوائے اس کے اور کسی جذبہ یا احساس کا نام زندگی نہیں ہو سکتا۔ سنگیت ہی سے ایک خلا سا پیدا ہوتا ہے۔ جو ایک تشنگی کا

زندگی کی بے مائیگی کا، بے معنگی کا اور نامکمل کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور ایسی کیفیت میں ہر جذبہ، ہر احساس اک ایسی روانی بن جاتا ہے۔ اور انسان تڑپ اٹھتا ہے کہ کہیں تشنگی بجھے۔ کہیں یہ خلا پُر ہو، کہیں اپنے معنی مل جائیں، کہیں ہم مکمل ہو جائیں۔ میں جب سنگیت میں کھو جاتی ہوں تو بڑی ہی شدت سے یہی ساری کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لگتا ہے مجھ سے وہ زندگی چھن رہی ہے جس میں ایک ایسا درد ہوتا ہے جس کی تہہ میں کچھ نہیں ہوتا، اور وہ دردِ تنہائی کے احساس کو کچھ اتنا بڑھا دیتا ہے کہ بس لگتا ہے میں کہیں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور ہوں تو بالکل ہی نامکمل۔ خالی خالی۔ دیوانہ وار ہر طرف دیکھتی ہوں کہ کوئی اس خلا کو پُر کر دے، میری تکمیل کر دے اور بہت قریب آ کر بجھا دے۔ میری پیاس۔"

اس اظہار کے ساتھ ہی اُس کا لہجہ ڈوب گیا۔ اُس کے سینے سے ایک آہ نکل گئی۔ یہ ساری باتیں اُس نے جیسے ایک بے خبری میں کی ہوں۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں جیسے ایک بے بسی کے عالم میں اُس نے اپنا صحیح اظہار کر دیا ہو۔

راجہ کے چہرے پر دو چراغ روشن ہو گئے۔ چراغوں کی لوئیں بڑھ گئیں۔ اسے ہر طرف ایک عجیب روشنی سی نظر آئی۔ پل بھر کو اُس نے سوچا کہ انسان اپنے جسم سے باہر بھی کہیں جیتا ہے سانس لیتا ہے محسوس کرتا ہے ــ اُس نے اپنے آپ کو اپنے جسم سے دُور دیکھا جہاں وہ زمین سے چھٹا ہوا تھا اور مدہوش تھا۔

~~~
~~~

(۱۷)

کھیل تماشے جس طرح ختم ہو جاتے ہیں اُسی طرح راجہ کی رنگنی سے پہلی ملاقات ختم ہو گئی
راجہ نے کہاں سوچا تھا کہ ایک کمسن، موہنی، لچکدار، تن و مند، خوش ذائقہ مدہوش
عورت اس طرح بنا بولے شیر لگائے مل جاتی ہے۔

نہ اُس کو اس کھلکھلانے والی لذت و سرشاری کا یقین ہو رہا تھا جو اُس کے ہر آتے
جاتے خیال میں بس گئی تھی نہ اُس کو یہ یقین ہو رہا تھا کہ بجلی کی رفتار کے ساتھ اُس نے
ایک نئی دنیا فتح کر لی تھی جس کے سامنے تاریخ کے بڑے بڑے ناتھوں کی ملک گیری بھی ہیچ تھی

رنگنی پہ یہ راز آج پہلی بار کھلا کہ اُسے جینے کے لیے صرف اپنے فن کی ضرورت تھی۔ فنکار
کی نہیں۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ آج پہلی بار اُس نے اپنے آپ کو سمجھا تھا۔ اور اب تک
وہ جو کچھ تھی، وہ سب کچھ غلط تھا۔ اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ دراصل آج تک تہہ کی ہوئی تھی
اور آج وہ تہیں کھل گئی تھیں۔ وہ آج اس طرح کھل گئی تھی جیسے زور کی ہواؤں سے
کشتیوں کے بادبان کھل جاتے ہیں۔ اب وہ ایک سیلِ تند و تیز بن گئی تھی اور ہواؤں کے رُخ
پہ بہہ رہی تھی۔ موجوں کے تھپیڑے تھے اور وہ اُن موجوں میں ڈوبتی اُبھرتی کناروں
سے دور نکل گئی تھی۔

وہ اپنے آپ کو منجدھار میں پا کر اس طرح مسرور ہو گئی تھی جیسے یقین ہو گیا ہو کہ بالکل
مختصر ہی سہی، دو گھڑی کی ہی سہی۔ لیکن زندگی اگر ہے تو یہی ہے۔

راجہ کو اپنی بات پہ یقین کرنے کے لیے تقریباً التجا کرتے ہوئے رنگنی نے کہا۔ "تم
مجھے کبھی کچھ نہ سمجھو، مگر تم سے میری پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ جب تم کسی کے ساتھ [illegible]
مجھے کوئی پروا نہ ہوگی نہ اعتراض تھا۔ لیکن ہمیشہ تم میرے سنگیت [illegible] اور

مجھے زیادہ جینے نہ دینا۔ جس دن، جس گھڑی میری لئے، میرے سُر بگڑتے معلوم ہوں، اس دن مجھے مار ڈالنا، ایک خنجر سے اور ویسے نہ بن پڑے تو زہر سے۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ تمھاری قسم۔

جانے کیوں اس ایک خواہش پہ جی بار بار تڑپ اُٹھتا ہے کہ میں کبھی کبھی ویسا نہ جیوں جیسے اس دنیا میں سب جیتے ہیں۔ نہ سہی میری زندگی کو زندگی نہ کہو، مگر مجھے جینے دو، میرے جنون کی آس اور میرے تن کی پیاس کے ساتھ ــــ بس!"

یہ باتیں سُن کر راجہ نے نہ رُکمنی کا ہاتھ تھاما نہ اُس کے قریب آیا۔ بس ایک موزوں دُوری کے ساتھ جو بیتابیوں سے معمور تھی، اُس نے رُکمنی سے کہا۔ "وہ وعدہ وعدہ نہیں ہوتا جو زبان سے کیا جائے۔ وعدہ تو وہ ہوتا ہے جو کوئی کسی کو چپکے سے، انجانے میں، ایک بھروسے اور یقین کی شکل میں دے دے۔ یہی ایک ایسا وعدہ ہوتا ہے جو کبھی بھی جھوٹا نہیں ہوتا۔"

رُکمنی ساری کی ساری راجہ کے قدموں میں بچھ گئی۔ اُس کی بھاری بھاری لمبی، سیاہ گھنی پلکیں بند ہو گئیں۔ اور پھر گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے لہجے میں اُس نے کہا۔

"بس دو گھڑی مجھے یوں ہی یہاں پڑے رہنے دو، مجھے نیند آ جائے گی۔ تم چپکے سے چلے جانا۔ میری طرف آنے والا ہر راستہ تمھارے ہاتھوں کے لمس کی آس لگائے رکھے گا۔ اب مجھے نیند آ گئی ہے۔"

راجہ کی سلگتی ہوئی آنکھوں کی چمک، رُکمنی کے کھلے کھلے بدن پر بوسے دیتی رہی پھر رُکمنی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ راجہ وہاں سے کب چلا گیا۔

~~~
~~~

(۱۸)

رُکمنی راجہ کی دیوانی ہو گئی تھی۔ اُس نے اُس رات کی پوجا کی تھی جس کی پُر اسرار اور پُر آشوب تاریکیوں نے شیام کو نہیں، راجہ کو اُس کے در تک پہونچا دیا تھا۔ رُکمنی کو راجہ اُس روپ میں ملا تھا جس روپ میں وہ شیام کو دیکھنے کے لیے باؤری ہوئی جاتی تھی رُکمنی کی اُس کیفیتِ جنون کو جس کو شیام تسلیاں دیا کرتا تھا راجہ نے اور اکسا دیا تھا تب رُکمنی نے محسوس کیا تھا کہ اُس کا سارا وجود جو آکر کہیں ٹھہر سا گیا تھا اب کھُلی ہواؤں میں تیر گیا ہے۔ دل میں ایک پھانس تھی جو نکلی تو تھی خونچکاں ہو کر لیکن دل اب آزادی سے دھڑکنے لگا ہے۔ جیسے زور و شور سے جی رہا ہو۔

اُدھر راجہ کو رُکمنی کے روپ میں وہ سب کچھ مل گیا تھا جو نہ راجہ مہاراجاؤں کو ملتا ہے نہ رشیوں منیوں کو۔ اُس کو من کے سُکھ کے ساتھ تن کی شانتی بھی مل گئی تھی۔ عورت کے روپ میں بہت سوں کو بہت کچھ مل جاتا ہے لیکن ایسا کب اور کہاں ہوتا ہے کہ ہر محبت ایک جنون خیز اظہارِ فن بن جائے اور ہر جذبے میں فن کی ٹیس پیدا ہو جائے۔

اُس نے ایک بھڑکتے شعلے کو آندھیوں کی زد سے بچا لیا تھا اور اُسے خاموش جلنا سکھا دیا تھا۔ رُکمنی نے ایک انجانی خوشی کے ساتھ اپنا تن، من، دھن سب کچھ راجہ کو تج دیا تھا۔ اب اُس کے پاس اُس کا اپنا کچھ نہیں تھا۔ بس اُس کا سنگیت تھا اور ہر لمحہ راجہ کے آنے کی آس تھی۔ اور اُس کے گھر سے کچھ دور ہٹتا ہوا پیپل تھا۔

~~~

ایک عورت کے مل جانے کے بعد شاید دوسری عورت کی خواہش شدید ہو جاتی ہے راجہ کا حال کچھ ایسا ہی تھا۔ شدید خواہش ہی تو جنون ہوتی ہے۔ راجہ کو جنون ہی تھا
~~~

کہ وشالی کو فتح کرنے والی وشالی تھی بھی کتنی مضبوط اور مغرور۔

وشالی کے اندر رکمنی کہیں نہیں تھی۔ لیکن وشالی کے اندر ایک اتنی وشال بھی تھی جو کسی کو مل جاتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے آگے عورت کا کوئی مصرف نہیں بس شرط یہ ہے کہ اس عورت کو کوئی مرد دیکھے۔

وشالی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ راجہ پوری طرح مغلوب ہو چکا ہے۔ رکمنی بھی خود اس سے۔ راجہ کو وہ جان گئی تھی۔ پہچان گئی تھی۔ اسکو یقین ہو گیا تھا کہ راجہ کے دل تک پہنچے تو حقوق کا نہیں لیکن جوانی کا سودا ضرور ہو جائے گا۔ کیسا پورا الّو لگتا ہے وہ!

مضبوط مرد کے پاس جب عورت کو اپنے تحفظ ہو جانے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ جرأت بھی کھلے بندوں ہر طرح سے عورت بن جاتی ہے۔ صرف عورت اور پھر اس کا وجود کسی طرح ڈھکا چھپا رہنا گوارا نہیں کرتا۔

اسی لیے جب راجہ نے شادی کا پیغام بھیجنے کی جرأت کی تھی۔ وشالی نے سوچا تھا کہ ہر عورت کو ایک مرد چاہیے۔ اس کے پاس شادی کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اس نے اپنے اندر ایک شدید خواہش محسوس کی تھی کہ راجہ کو زیر کرلے۔ وشالی خوب جانتی تھی کہ راجہ نے رکمنی کو زیر کرلیا ہے۔ لیکن یہ بھی مانتی تھی کہ رکمنی بھی عورت کا ایک سچا روپ ہے۔

وشالی کو ایک دن کشتاں کشتاں رکمنی کے پاس جانا پڑا۔ اس کے لیے رکمنی کا وجود ایک پُر لطف خطرہ بن گیا تھا۔ اور وہ اس خطرے کے قریب ہو کر کچھ اسکی خوشبو کی کھوج کرنا چاہتی تھی۔ موسم بھی کچھ مبہم مبہم سا تھا۔ اس کی ہواؤں کو محسوس کرنے سے ایک طوفان کا یقین ہو رہا تھا لیکن کوئی ڈر نہیں ہوتا تھا۔ ہوائیں سسکنے لگیں۔ فضا میں بگولے اڑنے لگے۔ کچھ گمان جیسے بادل بھی

چھانے وکی فاؤ سینے لگے۔ اور بنا اپنا مرضی کے بادل گرجنے بھی لگے۔ وشالی نے ایک خواہش کے زیر اثر نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں کہ کچھ بوندیں برس جائیں تو اس پاس اڑنے والی دھول دب جائے اور اس کے اپنے خیالوں میں خوشگوار خنکی و تازگی پیدا ہو جائے۔

وشالی نے جب رکمنی کے گھر میں قدم رکھا تو اس کی آنکھیں بہ سنجیدہ تھیں نہ چپ چاپ۔ کچھ بولنا چاہتی تھیں، کچھ سننا چاہتی تھیں۔ اچانک ہوائیں کچھ تیز ہو گئیں بالوں کی کچھ لٹیں اس کے گالوں کو چھیڑنے لگیں، اس کی پیشانی کو گدگدانے لگیں۔ اس نے اپنے لباس کو سنبھالا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنے بالوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا۔ لیکن جانے وہ کس آنگن میں آگئی تھی کہ ہوائیں بھی وہاں آکر کچھ زیادہ ہی آوارہ لگتی تھیں۔ پھر ان ہواؤں نے اس کے اندر ایک الجھی لہر پیدا کر دی جسے شوخی بھی کہتے ہیں، شرارت بھی۔ وشالی نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر بے خبر نہیں پایا تھا۔ کوئی ترنگ ہی تھی جو اس آنگن میں آتے ہی اس نے محسوس کی تھی۔

متبسم نظر اٹھا کر جو اس نے ذرا اندر دیکھا تو وہ اپنے اندر ہی اندر کھلکھلا اٹھی۔ رکمنی سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔ وشالی کو غور سے دیکھتے ہوئے، مسکراتے ہوئے وہ اچانک بول پڑی۔

"تم کو دیکھ رہی ہوں تو یقین ہو رہا ہے کہ میرے آنگن میں بھی کوئی رانی مہارانی آ سکتی ہے۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ عورت اتنی زیادہ حسین اور باوقار ہو سکتی ہے۔"

وشالی کے اندر جو ایک لہر اٹھ رہی تھی وہ ایک لطیف سی ہنسی بن کر فضا میں بکھر گئی۔

وشالی نے رکمنی کو دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی ــــ "ہر طرف گلاب ہی کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔"

رُکمنی کی طرف اُس نے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہ کسی چیز کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔
"گلاب کا پھول جب اپنی ہی نمی میں بھیگ بھیگ جاتا ہے تو اُس کی مہک میں کتنا رسیلا
پن آ جاتا ہے۔ یہ بھیگا پن!!!" رُکمنی نے شاید ابھی غسل کیا تھا۔ اُس کے
گیلے بال اُس کے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے اور بدن بھیگے گلاب کی پنکھڑیوں جیسا

اِدھر اُدھر عیاں عیاں تھا۔
دونوں کی تیکھی چتون ـــ دونوں کے رُخ روشن۔ دونوں ایک دوسرے
کے سراپے کو دیکھنے کے انداز میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اور اپنے اپنے دل کی آواز
سنتے ہوئے۔
دو لمحے چپ کیا گزرے دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ لیا۔ پھر
اچانک جب سیاہ بادل کا ٹکڑا آسمان پہ چھا گیا، ایک گرج ہوئی اور کچھ بوندیں
برسنے لگیں۔ رُکمنی نے زبان کھولی۔

"اندر آ جاؤ۔ میں سب جانتی ہوں تم کیوں آئی ہو۔"
"میں اندر آ جاؤں گی تو۔ لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ویسے میں وقت
کی غلام نہیں۔" وشالی رُکمنی کی طرف بڑھ گئی۔ رُکمنی کے قریب پہنچ گئی۔ ایک
بجلی چمکی تو دونوں ہنس پڑیں۔ پڑے ہی کھلنڈرے پن سے رُکمنی نے کہا۔
"راجہ بھی کہتا تھا کہ تم وقت سے بھی زیادہ مغرور ہو۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتیں۔"
وشالی مسکرا پڑی۔ بولی۔ "راجہ مجھے نہیں جانتا۔ راجہ تم کو جانتا ہے۔ کیا
سچ مچ تم راجہ کی ہو چکی ہو؟"
"یہ مجھے معلوم نہیں کہ میں راجہ کی ہوں یا راجہ میرا۔ سچ سچ بتاؤں؟ مجھے اب
ایسا لگتا ہے کہ پہلے تو راجہ سے اچھا مرد دنیا میں ہوگا نہیں۔ اور ہوگا تو مجھے ملے
گا نہیں۔ بس راجہ میری تکمیل ہے۔ لیکن راجہ کو جب میں نے اپنایا تو اُس سے

یہ بھی کہہ دیا۔ "تم چاہو کسی کے ہو جاؤ۔ مجھے نہ کوئی پرواہ ہوگی نہ اعتراض ہوگا۔"

"کیا تم یہ سب کچھ کر سکو گی؟"

"میں سمجھتی ہوں میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جانے کیوں میں بار بار اپنے اندر بول اٹھتی ہوں کہ مجھے تو تنہا تنہا جینا ہے۔ تنہا تنہا میٹھے سُروں میں ڈوب جانا ہے۔ لیکن اس وقت کو، اس زہر کو کیا کروں جو میرے جسم کے روئیں روئیں میں سمایا ہوا ہے۔ جانے کس ... بے خبری میں میں نے کبھی یہ پی لیا تھا۔ یا پھر کسی نے پلا دیا تھا۔ یہ زہر کیسا ہے کہ مارتا نہیں، بس تڑپاتا ہے۔"

رکمنی کا ایک ایک لفظ وشالی کو پارے کی ایک ایک بوند کی طرح ڈستا لگ رہا تھا۔

"تم نے راجہ کو ایسا وچن کیوں دیا۔؟" وشالی نے پوچھا۔

"مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی میرا نہ ہو۔ اور میں کسی کی نہ ہوں۔ ایسا کہتے ہوئے مجھے ایک خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو کچھ عجیب سی لگتی ہوں۔ لگتا ہے کہ میں خاک ہوں نہ خون۔ بس ایک جذبہ ہوں، ایک حباب ہوں۔ میں نے راجہ سے بنتی کی ہے کہ مجھے زیادہ جینے نہ دینا۔ جس دن میرے سُر بکھر جائیں، اس دن مجھے مار ڈالنا۔ ایک خنجر سے اور میں نہ مرے تو زہر سے۔"

وشالی کو شاید پہلی بار اپنے اندر کہیں کوئی چیز کم کم محسوس ہوئی، اُسے یوں ہی خیال آیا کہ کہیں وہ ہار تو نہیں رہی ہے یا پھر اُس کا یہ واہمہ ہے۔ اب وہ کچھ حیرت زدہ ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی اُسے یہ خیال آیا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو جو کچھ یا جیسا کچھ بھی سمجھ رکھا تھا، وہ غلط تھا اور رکمنی کے بارے میں اُس نے جو کچھ بھی اندازے لگائے تھے وہ بھی غلط تھے۔ "یہاں تو سب کچھ غلط ہے۔" وشالی نے ایک بار اپنے آپ پہ نظر ڈالنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رکمنی نے جو اُسے اس حالت میں دیکھا تو بولا

پیر گئی۔

رہتے ہیں اور ایسی ہر بے معنیٰ سچائی کے خلاف ایک معنیٰ خیز جھوٹ نظر آتے ہیں۔ تہذیب دشمن یہ کلا کار لوگ!! خود اپنے ہی دشمن ہوتے ہیں۔ جینا بھی نہیں چاہتے لیکن جینے کی ہوس تو ان کو ہوتی ہے جو خوف و ہراس کی کھائیوں میں مسلسل بھٹکتے رہتے ہیں اور ہر وقت جن کی عمر بڑھتی نہیں گھٹتی رہتی ہے۔

اتنا سب کچھ سوچنے کے بعد بھی وشالی طے نہیں کر پائی کہ اسے رکمنی سے دراصل کیا کہنا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک بد وضع سا خیال ابھرا۔ ”اگر رکمنی دکھی نہیں ہے تو کیا میں دکھی ہوں؟؟“ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے رکمنی کو اس طرح دیکھا جیسے کسی قابلِ رشک مقابل کو دیکھ رہی ہو۔

اب وشالی کا کوئی خیال اس کے ابروؤں کا ایک خم بن کر ابھرا۔ وہ اب تک اپنے خیالات کے ساتھ ساتھ جو کچھ غیر متناسب ہو گئی تھی۔ اچانک بدل گئی۔ وہی تیکھا پن، وہی پُروقار تیور، وہی متناسب بدن اور وہی وشالی نظر۔

اب بڑے ہی سنبھلے سنبھلے اور دھیمے لہجے میں وہ رکمنی سے مخاطب ہوئی: ”تم جو کچھ بھی ہو، اچھی ہو۔ مجھے تم پسند آئی ہو، اس لیے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بھی کسی مرد کی مجبور نہیں ہو۔ اور تم اپنی بدنامی کو برا نہیں، بلکہ اچھا سمجھتی ہو۔“

رکمنی کو اس بات پر گدگدی محسوس ہوئی اور وہ ہنس پڑی۔ وشالی کی نظر رکمنی کے ساز پر پڑی۔ وہ مسکرا پڑی اور پوچھا۔

”تم کو تمہارا ساز زیادہ پسند ہے یا راجہ؟“

”راجہ“

”راجہ“!! وشالی نے کچھ چونک کر پوچھا۔

”ہاں“ رکمنی نے بڑی ہی بے باکی سے کہا۔ ”راجہ میرے لیے ایک جیتا جاگتا ساز ہے۔ جب میں اسے سنتی ہوں تو لگتا ہے کہ یہ ساری دنیا سنگیت کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن، میں جانتی ہوں کہ راجہ تم پہ مرمٹا ہے۔ وہ جس رات ندی کنارے تم سے ملنے آیا تھا اور تم نے جو پیام میرے پاس بھیجا تھا وہ بھی مجھے خوب یاد ہے تم نے کہلا بھیجا تھا "مجھ سے ملنے کے بعد تمھارا مرد، پھر تمھارا ہو سکتا ہے" اگر وہ تجھے پسند نہ آتے، ورنہ عمر بھر نہیں ہوتا؟"

"ہاں" بڑے ہی پُر اعتماد لہجے میں وشالی نے اُسے اتنا مختصر جواب دیا۔

رُکمنی نے کہا۔ "آج بھی راجہ سے میں یہی کہتی ہوں کہ وہ تمھارا ہو جائے۔ میں اُس سے پھر کہوں گی۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس بات کا فیصلہ صرف مجھ پر رہے گا" راجہ پر نہیں۔ بہت ممکن ہے میں راجہ سے شادی کر لوں۔ میں اب جا رہی ہوں۔"

"اچھا جاؤ۔ تم کو تو میں اپنے آپ سے بڑا مان چکی ہوں۔ اس لیے کہ تم اپنے آپ سے مجبور رہنیں ہو، اور میں ہوں۔"

وشالی نے جب رُکمنی کے گھر سے باہر قدم بڑھائے تو ایک بجلی چمکی۔ بادل بھی گرج اُٹھے۔ ہوا کچھ تیز ہو گئی۔ وشالی کے نرم و ملائم بال پھر اُڑنے لگے۔ گالوں پر بکھرنے لگے۔ اُس نے اپنے ایک ہاتھ سے اپنے بکھرے بالوں کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے اُڑتے ہوئے لباس کو۔ اُس کا لباس سنبھالے نہ سنبھلتا تھا کہیں بدن سے چپکا ہوا کہیں بدن سے دور۔

وہ اس طرح آگے بڑھ رہی تھی اور رُکمنی اپنی ہنستی آنکھوں سے اُس طوفانی موسم سے ایک حسینہ کو گذرتے ہوئے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اتنا حسین منظر کسے پھر شاید ہی دیکھنے ملے بہت دیر تک وہ وشالی کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس بوڑھے پیپل کے پاس پہونچ کر وشالی اُس کی نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔

رُکمنی دھیرے دھیرے واپس اپنے آنگن میں آ گئی۔ دو چار بوندیں اُس کے

جسم پر بھی گریں۔ رکمنی کا دماغ ابھی اس کے قابو میں نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیسے یہ خیال اس کے ذہن میں آیا۔ زندگی کا ہر جذبہ کس قدر بے لطف ہے کتنا مختصر ہے اور کتنا بے معنی۔ میں کیوں ہنسوں یا روؤں۔ کچھ اور بھی تو کر سکتی ہوں۔ اس نے موسم کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ساز کے تار اس طرح چھیڑ دیئے جیسے کبھی ایسے ہی بے معنی جذبہ سے یا ہلکے سے ذہنی انتشار سے وہ مجبور ہو گئی ہو۔ جیسے وہ چاہتی ہے کہ ساز کے تار چھیڑنے سے جیسی لہر پیدا ہوتی ہے ویسی ہی لہر اس کے اندر پیدا ہو جائے اور راجہ آجائے۔

---

(۱۹)

دشالی نے راجہ کے پاس ایک پیام بھیجا۔ "آج سے ٹھیک دس دن بعد میں تم سے بیاہ کر لوں گی۔ تم چاہو تو اپنی مرضی سے جو تیاری کرنا ہے کر لینا۔ میرے پاس کسی رسم و رواج کی اہمیت نہیں۔ تم چاہو تو یہ دس راتیں رُکمنی کے ساتھ گذر سکتے ہو۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ شادی کے بعد تم میرے ہو لوگے اور میں تمھاری۔"

اس پیام کے ملنے کے بعد راجہ سیدھا رُکمنی کے پاس پہونچا۔ سب کچھ سنایا تو رُکمنی نے کہا۔ "دشالی سے تمھاری منگنی تو میں نے پکی کی تھی۔ تم میرے پاس آنا آؤ، نہ آؤ، میرا دروازہ تمھارے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔"

"رُکمنی کبھی صرف یہی سوچنے لگا ہوں کہ کیا واقعی ایک عورت یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔"

"ہاں، شرط یہ ہے کہ وہ رُکمنی ہو۔ راجہ اگر تم دشالی کے نہ ہوتے تو کسی اور کے نہ ہوتے۔ صرف میرے ہوتے۔ میری دنیا میں میرے لیے صرف دشالی ہی ایک ایسی عورت ہے جو میرا مقابل آ سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ راجہ کو پانے کے بعد دشالی راجہ کی مجبور ہو جائے اور ساری دنیا میں صرف میں ایک عورت بنی رہوں۔"

"سچ سچ بتاؤ تم نے شادی کرنے کی خواہش کیوں نہیں کی۔؟"

"اوہ راجہ۔" رُکمنی نے چڑ کر کہا۔ "تم مجھ سے بس یہ سوال نہ کرو۔ میں کیسے بتاؤں، کیسے سمجھاؤں کہ میں اپنے اندر ایک عجیب سا خلا محسوس کرتی ہوں جو مجھے آگ کی طرح سلگاتی رہتی ہے اور تنہا جینے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن کوئی میری اس بات کو، میری اس خواہش کو سمجھ نہیں پاتا۔ کیا کہوں؟ دیکھو راجہ۔" رُکمنی نے اپنے بدن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ لے لو۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں اپنے بدن سے دور بھی کہیں رہتی ہوں۔ کچھ دور۔ گہرائیوں میں، بلندیوں پہ۔ میں نہیں سمجھتی وہ احساس جسے ہم شانتی کہتے ہیں۔ کبھی کسی کے نصیب میں ہوتا بھی ہے۔ چھوڑو یہ بات۔"

راجہ نے کہا۔ "جانتی ہو میں آج کی رات تمہارے ہاں گذار رہا ہوں۔"

"شوق سے۔"

پھر رات ہو گئی۔ اندھیری، گہری۔ خاموش۔ رات بھر راجہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہر گھڑی اسے ایک ناگن لپٹی رہی۔ بار بار ڈستی رہی۔ اور وہ زہر پیتا رہا۔

صبح اٹھ کر جب وہ جانے لگا تو رکمنی نے اسے ایک پیالہ لا کر دیا۔ پیالہ کسی مشروب سے بھرا ہوا تھا جو خود رکمنی نے تیار کیا تھا۔ رکمنی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پیالہ تھامے پیالہ راجہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ جب راجہ نے پیالہ خالی کر دیا تو بڑی بڑی گہری اور سب کچھ بولنے والی نظروں سے دیکھا۔ سامنے کھڑی رکمنی اسے سر تا پا ننگی نظر آئی۔ راجہ نے لپک کر کہا۔ "رکمنی مجھے صرف عورت چاہیئے۔ اور تم عورت ہو۔ تمہارے سوا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ اے عورت! یہ مرد پھر تیرے ہی پاس آنے کے لئے میں جا رہا ہوں۔"

راجہ دھیرے دھیرے چلا گیا۔

~

(۳۰)

راجہ کے گھر میں جو اُس کی ایک بوڑھی ماں تھی وہ مر چکی تھی۔ باپ کبھی زندہ نہیں تھا
بس ایک رشتہ کی بہن تھی جس کو وہ کبھی اپنا بنانا چاہتا تھا لیکن اُس کا کسی اور سے بیاہ ہو گیا
تھا اور وہ اپنے سسرال چلی گئی تھی۔ راجہ نے طے کیا کہ وہ اپنی شادی میں اُس رشتہ کی بہن کو
ضرور بلائے گا اور اُس کے لوگوں کو بھی دعوت دے گا۔ اُس نے سفر کی تیاری کر لی۔ اپنے
گھوڑے پر سوار ہوا اور چل پڑا۔

اُس کی بہن کے گاؤں جانے کے لیے پہلے تو بستی کے قریب والی پہاڑی کے دوسری
طرف اُترنا پڑتا تھا۔ پھر قریب دس پندرہ میل جنگل سے گذرنا پڑتا تھا۔ جنگلوں
سے آگے ایک چوڑی چکلی ندی ملتی تھی۔ ندی میں پانی بھی گہرا ہوتا تھا۔ ندی پار کر کے
پھر تھوڑی دور گھوڑا دوڑتا تو ایک بہت بڑا میدان نظر آتا تھا۔ ہر طرف پھیلا
ہوا لیکن میدان میں ٹیلوں جیسی چھوٹی بڑی چٹانیں ملتی تھیں۔ ہر رُخ پہ پھیلی ہوئیں۔
بہت ہی اونچی اونچی۔ ہر مسافر کا جی چاہتا کہ چٹانوں کی چوٹی پہ چڑھ کر میدانوں کا نظارہ کرے۔
اُس چٹانوں والے میدان سے گذرنے کے بعد علاقے کے مشہور باغات ملتے تھے۔ سنتروں کے،
سیوٹوں کے، سیب، ناشپاتی کے، اور کچھ آگے اُس علاقے کا سب سے مشہور اور سب سے
بڑا آم کا باغ ملتا تھا۔ قریب میل ڈیڑھ میل پھیلا ہوا۔ اُن آم کے پیڑوں کے نیچے سے
راستہ گذرتا تھا۔ گھوڑے پہ بیٹھ کر گذرو تو سر جھکائے ہوئے۔ [illegible]
آم کے اُس باغ سے جب گھوڑا باہر نکلتا تو اچانک اپنی رفتار تیز کر دیتا اور میدان کو
دوڑنے لگتا۔ لیکن تھوڑے فاصلے پہ جا کر خود ہی رُک جاتا۔ سامنے پڑتی تھی صاف
پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل پڑتی تھی۔ بالکل روپہلی ریت پہ نیلگوں، [illegible] پانی۔

دیکھتے ہی ہر مسافر کے سارے بدن میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ جاتی اور طبیعت پہ ایک تازگی
آ جاتی ۔ ہر مسافر مجبور ہو جاتا تا کہ وہاں کچھ دیر ٹھہرے ، پانی سے کھیلے ۔ اپنی پیاس بجھائے
یہ جھیل بھی ایسی اتھل کہ تہہ کی ریت یہاں سے وہاں تک ساری کی ساری نظر آئے۔
کہیں نہ گہرائی کا گمان نہ پھسلن کا اندیشہ ۔ جھیل کے پچھلی کنارے پر سبز سے گوندھی
ہوئی ایک پگڈنڈی ۔ مسافروں کے لیے منزل کی نشاندہی کرتی ہوئی ۔

جھیل سے جب راجہ آگے بڑھ گیا تو اسے لگا اس کا گھوڑا اس جھیل پہ عاشق
ہو گیا ہے ۔ مڑ مڑ کے ، وہ اپنی گردن موڑ موڑ کر بڑی ہی مستانہ نگاہوں سے جھیل
کو دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا ۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے
گھوڑے نے چوری سے پھر پلٹ کر دیکھا تو جھیل نظروں سے غائب ہو گئی تھی ۔ گھوڑے
کی رفتار سست پڑ گئی جیسے وہ تھک گیا ہو ۔ راجہ نے ایڑ لگائی تو وہ آگے بڑھا
اور صحرا کا ہو گیا ۔ دیوانہ وار دوڑنے لگا ۔ آگے جانے کتنے ہی پیڑ قطار اندر قطار
کھڑے ہوئے تھے ۔ تھوڑی دور آگے ایک چھوٹی پہاڑی سی نظر آئی ۔ ان اونچے پیڑوں
پہاڑی کے بیچ کوئی پر اسرار وادی نظر پڑتی تھی ۔ راجہ جب اس وادی میں پہونچا تو
خیال آیا ۔ "یہ سب جھوٹ ہے کہ وقت بدلتا رہتا ہے ۔ نہ رات ہے نہ دن ، ایک
سا رنگ ہے ۔ ایک عجیب سما ہے کہ وقت یہیں پہونچ کر دن اور رات کی قید سے آزاد
ہو جاتا ہے ۔"

اس وادی سے گذرتے ہوئے جب ذرا پہاڑی کے رُخ پر راجہ نے نظر ڈالی
اسے ایک عجیب منظر نظر آیا ۔ جانے کتنے ہی لال پیلے ، اودے ، ہرے ، نیلے ، گلابی
قرمزی رنگ کے چھوٹے بڑے جھاڑ اور پودے اس کا راستہ روکے کھڑے ہوئے
ہیں ۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ آخر وہ کون سا خواب دیکھ رہا ہے اور اب آگے کیا ہونے
والا ہے ۔ اس نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا ۔ ا

کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ سب وہاں اپنا سر جھکائے اور ہاتھ جوڑے اُس کا راستہ روکے ہوئے کھڑے ہیں جیسے کسی علاقے کی رعایا اپنے رجواڑے کا سواگت کر رہی ہو۔ راجہ اس خوش رنگ منظر میں کھو تو گیا لیکن اُسے ایسا بھی لگا کہ اُسے تھوڑا سنبھلنا چاہیئے۔ جب وہ کچھ اور آگے بڑھ گیا تو دیکھا کتنے ہی سُرخ و سفید چہرے والے لوگ کھڑے ہیں اُن کے چہروں کی تازگی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جھیل کے پجاری ہیں اور اُس وادی کی کوئی لافانی مخلوق۔

کہیں کسی کے چہرے کو دیکھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی دھوکہ ہے نہ کوئی فریب۔ ہر چہرے پر ایک عجیب سی سادگی اور معصومیت ہے کہ اُن کو دیکھنے سے کچھ اپنے ہی ضمیر پہ دھوکہ ہوتا ہے۔

راجہ جب اُن کے بہت قریب پہونچ گیا تو اُس نے دیکھا کہ کوئی سادگی اور پاکیزگی کا مجسمہ اسکی طرف بڑھ آ رہا ہے۔ اسکے چہرے پر بڑی ہی خوش رنگ جھرّیاں تھیں۔ اُس کے سینے کو چھوتی ہوئی برف جیسی سفید اور صاف ستھری ڈاڑھی تھی۔ وہ اُس کا راستہ روکے کھڑی رہنے والی مخلوق کا کوئی راہبر لگتا تھا۔ آگے بڑھ کر اُس نے راجہ سے بڑے ہی مودبانہ لہجے میں بات کی۔

"آپ اگر گھوڑے سے اُتر جائیں تو ہم سب آپکو اپنی پلکوں پہ بٹھا کر لے جائیں گے"

"لیکن کیوں؟" راجہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

"لگتا ہے آپ تو آسمان سے اُتر آئے ہیں۔ ہم کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آئیں گے ہیں!!"

"ہاں، آپ" بزرگ نے بڑی ہی پُرسکون مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اجازت دیجیئے تو لگام تھام لوں"

سچا ایمان تو جیسے اچھی فطرت کے ساتھ ہی جنم لیتا ہے اور زندگی بھر فطرت بنا رہتا ہے۔
عمر رسیدہ چہروں کی جھریوں میں چھپی چھپی معصومیت اور نور اس طرح باقی جیسے
بچپن سے اب تک زندگی کے کسی اچھے برے لمحے نے چھوا تک نہ ہو۔

راجہ کو یہ خیال ضرور آیا۔ کیا یہی تو وہ مخلوق نہیں جس کے لیے اصل میں یہ دھرتی بنی
ہے۔ یہ سارا آکاش بنا ہے۔ یہاں تو کسی کو یہ احساس تک نہیں کہ دھرتی سے اٹھ کر آکاش
چلے جانا کوئی دکھ کی بات ہے اور دھرتی اور آکاش پر بسنے والی زندگیوں میں کوئی فرق بھی ہے۔
راجہ کو ان سب کے لباس بہت بھا گئے۔ ڈھیلے ڈھالے، رنگ برنگے لباس، جن میں
ہر رنگ شامل تھا۔

اس راہبر بزرگ نے مسکرا کر ایک بار راجہ کو دیکھا جیسے یقین کر لینا چاہتا ہو کہ راجہ کو
نہ کسی بات کی پریشانی ہو رہی ہے نہ کوئی بات ناگوار گزر رہی ہے۔ راجہ کچھ اس طرح خوش
تھا جیسے اس میں ایک نئی امنگ جاگ گئی ہو اور وقت کا اسے کوئی احساس نہ رہا ہو۔ وقت
کی قید سے آزاد ہونا بھی تو اپنی جگہ ایک اعجاز ہے۔ زندگی کی ایک اعلیٰ و ارفع منزل ہے۔

بزرگ نے بڑے ہی شیریں لہجے میں مخاطب ہو کر راجہ سے کہا۔ "اب آپ خیمے میں چلیئے
آپ کو آرام ہوگا۔" پھر اس کی طرف دیکھنے والی ساری مشتاق نظروں نے اس سے یہی التجا کی۔
راجہ چپ تھا، لیکن اس کی مسکراہٹ اسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ ان سب کا جواب دے رہا
ہے۔ ان سب سے گفتگو کر رہا ہے اور ان سب سے اس کی شناسائی بڑھ رہی ہے۔

راجہ نے اس بزرگ کی رہبری میں خیمے کے اندر قدم رکھا۔ اس خیمے کے اندر بھی اسے
کئی رنگ نظر آئے۔ رنگ برنگا فرش۔ سامنے ایک گلرنگ مسند بچھی ہوئی جس کے مخمل کی
سرخ رنگت اس میں ایک احساس شہنشاہی پیدا کر رہی تھی۔ مسند پر وہ پھول بکھرے
ہوئے تھے جو مسند پر ہی کھل اٹھے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پر ایک منقش پیالے کو ڈھکا
ایک ساغر زرنگار جام سے لگی رکھی تھی۔

راجہ کو یہ خیال ضرور آیا۔ کیا یہی تو وہ مخلوق نہیں جس کے لیے اصل میں یہ دھرتی بنی ہے۔ یہ سارا آکاش بنا ہے۔ یہاں تو کسی کو یہ احساس تک نہیں کہ دھرتی سے اٹھ کر آکاش چلے جانا کوئی دکھ کی بات ہے اور دھرتی اور آکاش پر بسنے والی زندگیوں میں کوئی فرق بھی ہے۔ راجہ کو اُن سب کے لباس بہت بھا گئے۔ ڈھیلے ڈھالے، رنگ برنگے لباس، جن میں ہر رنگ شامل تھا۔

اس راہبر بزرگ نے مسکرا کر ایک بار راجہ کو دیکھا جیسے یقین کر لینا چاہتا ہو کہ راجہ کو نہ کسی بات کی پریشانی ہو رہی ہے نہ کوئی بات ناگوار گذر رہی ہے۔ راجہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے اُس میں ایک نئی اُمنگ جاگ گئی ہو اور وقت کا اُسے کوئی احساس نہ رہا ہو۔ وقت کی قید سے آزاد ہونا بھی تو اپنی جگہ ایک اعجاز ہے۔ زندگی کی ایک اعلیٰ و ارفع منزل ہے۔

بزرگ نے بڑے ہی شیریں لہجے میں مخاطب ہو کر راجہ سے کہا "اب آپ خیمے میں چلیے آپ کو آرام ہوگا۔" پھر اس کی طرف دیکھنے والی ساری مشتاق نظروں نے اُس سے یہی التجا کی۔ راجہ چپ تھا، لیکن اُس کی مسکراہٹ اُسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ اُن سب کا جواب دے رہا ہے۔ اُن سب سے گفتگو کر رہا ہے اور اُن سب سے اُس کی شناسائی بڑھ رہی ہے۔

راجہ نے اُس بزرگ کی رہبری میں خیمے کے اندر قدم رکھا۔ اُس خیمے کے اندر بھی اُسے کئی رنگ نظر آئے۔ رنگ برنگا فرش۔ سامنے ایک گلرنگ مسند بچھی ہوئی جس کے مخمل کی سرخ دمک اُس میں ایک احساسِ شہنشاہی پیدا کر رہی تھی۔ مسند پر وہ پھول بکھرے ہوئے تھے جو مسند پر ہی کھل اُٹھے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پہ ایک طباقِ سیمگوں میں ایک ساغرِ زجاج سے لگی رکھی تھی۔

آنکھوں کی بڑھتی ہوئی روشنی کو پڑھ لیا۔ اور اچانک اپنا رعشہ دار ہاتھ راجہ کے سامنے پھیلا کر کہا۔ "کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

راجہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک روشنی سی کوند گئی۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک نامکمل مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کچھ اپنے آپ کو سنبھالنے کے انداز میں کہا۔

"میں!! میں تو۔"

بزرگ نے اپنے لہجے کو پُرسکون بناتے ہوئے کہا۔

"آپ کوئی فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس تو یہ بیاہ صرف ایک رات کا بیاہ ہوگا۔ ایسے بیاہ میں پتی پتنی صرف ایک رات ایک ساتھ گذارتے ہیں اور پھر دوسری صبح ہمیشہ کے لیے ان کو الگ ہو جانا پڑتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔ ہو سکتا ہے یہ بات دونوں کے لیے بہت کٹھن ہو لیکن یہی وہ بلیدان ہے جو ایک لڑکی اپنی زندگی بنانے کے لیے دیتی ہے اور ایک حوصلہ مند نوجوان ایک لڑکی کی زندگی کی خاطر دیتا ہے۔ کیا آپ سے یہ بات ممکن ہے؟"

لمحہ بھر تو راجہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس نے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ بزرگ کو وہ اپنی کہانی بھی سنائے کہ ایک ہفتہ بعد تو اس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی کس سے!! پھر سوچا آخر رکھی بھی تو اس کی زندگی میں کچھ ہے۔ چلو یہ لڑکی بھی کچھ ہو جائے۔ سفر یاد رہے گا۔"

راجہ کو اس طرح چپ دیکھ کر بزرگ نے کہا۔

"لڑکی یہ ساری باتیں جانتی ہے۔ اور اس کی بھی یہی شرط ہے۔"

راجہ کے سینے میں ایک ولولہ اُٹھا۔ "بہادر آدمی کہاں اتنا کچھ سوچتے ہیں' جو میں سوچتا ہوں۔" اس نے بڑے ہی سنجیدہ لہجے میں بزرگ کو مخاطب کیا۔

"اگر آپ کے قبیلے کی میں اس طرح کوئی مدد کر سکتا ہوں تو میں اس بات کے لیے

کچھ ایسا اشتیاق تھا کچھ ایسی بے چینی تھی اس کی آنکھوں میں کہ اگر بزرگ کہانی کو وہیں نامکمل چھوڑ کر اٹھ جاتا تو راجہ یقیناً اُس کو پکڑ کر بٹھا لیتا اور منت کرتا "بابا بتائیے پھر کیا ہوا۔"

بزرگ نے اب تک یہ کہانی جس آسانی اور پُراشر انداز میں کہی تھی۔ اُس انداز کو برقرار رکھنا اُس کے لیے اب کٹھن ہو گیا۔ بزرگ کچھ رُک رُک گیا۔ ایک بار راجہ کی پُر اشتیاق نظروں کی طرف دیکھا تو کچھ ہمت بندھی۔ لیکن پھر پلکیں جھکا کر چپ ہو گیا اور اسی طرح پلکیں جھکائے گویا ہوا۔

"ہمارے قبیلے میں یہ بات برسہا برس سے چلی آرہی ہے اور یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ کسی لڑکی کے جب دو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو اس کا تیسرا رشتہ قبیلہ کے تیسرے لڑکے سے نہیں ہو سکتا۔ یا تو لڑکی عمر بھر کنواری رہتی ہے یا پھر اس کا بیاہ صرف ایسے نوجوان سے ہو سکتا ہے جس کا ہمارے قبیلہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس بات پر تو راجہ کے اندر ایک شعلہ سا لپکا۔ لیکن وہ اپنے کسی جذبے کو سنبھالے رکھنے کے انداز میں کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

بزرگ نے کہا۔ "اب ہمارے سارے قبیلہ کی خواہش ہے، کوشش ہے کہ مرزی جیسی حسین و معصوم لڑکی کو زندگی بھر کے کنوارے پن کی اذیت سے بچایا جائے اور اس کی شادی کسی ایسے نوجوان سے کر دی جائے جس کا ہمارے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں۔"

راجہ کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک سوال اُٹھا۔ لیکن اُس سوال کو وہ اپنے ہونٹوں تک نہ آنے دینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بالکل چپ رہا۔ راجہ نے محسوس کیا کہ اچانک کچھ ایسی ہلکی ہلکی ہوائیں اسے چھو کر گذر رہی ہیں جو قبیلے کے خیموں سے کچھ خوشبوئیں ساتھ اٹھا لائی ہیں۔

بزرگ کی جہاں دیدہ نظروں نے راجہ کے چہرے کی بڑھتی ہوئی سرخی اور

"تیار ہے جناب۔"

بزرگ نے آگے بڑھ کر راجہ کو سینے سے لگا لیا۔ انہوں نے بچوں کو آواز دی۔ دو معصوم سے
خوبصورت بچے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں تازہ پھولوں
کے دو ہار تھے۔ بچوں نے راجہ کو ہار پہنائے اور بزرگ نے خیمہ سے باہر جا کے کچھ اشارہ
کیا۔ اچانک ایک شور مچ گیا۔ جیسے کتنے ہی نفوس کا گروہ اس خوشخبری کا منتظر تھا۔
بلند و بالا قہقہے سنائی دینے لگے۔ لڑکیوں کی ہنسی کی چھنچھناہٹ سنائی دینے لگی۔ پھر
شادیانے بجنے شروع ہوئے۔ نفیر بجنے لگی۔ ڈھولک پیٹے جانے لگے اور راجہ کے خیمہ
میں گلاب کا چھڑکاؤ ہونے لگا۔ خیمے کے سامنے رنگ بکھرنے لگے۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔
راجہ کے خیمے میں اس کی مسند تک ایک سرخ سرخ غالیچہ بچھ گیا اور دو
پھلجھڑیاں، پھلواری جیسا شاداب لباس پہنے سبک خرام خیمہ میں داخل ہوئیں۔
دونوں کے ہاتھوں میں پھلوں کے کشتیاں تھیں۔ کچھ رسیلے پھل، پھلوں پر سے نظر
اٹھا کر راجہ نے سامنے کھڑی تھرکتی ہوئی رسیلی جوانیوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ کچے رسیلے جیسی،
گلاب کے پھول، شبنم کی نمی۔ راجہ نے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"پھل ہیں۔"

"کچے ہیں یا پکے؟"

"چھو کر دیکھ لینا۔" راجہ نے پھلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ پھلوں کی کشتیوں کو
نیچے رکھ کر دونوں پھلجھڑیاں خیمے سے باہر بھاگ گئیں۔ راجہ کی نظروں میں اب پھل ہی پھل
تھے کچے، رسیلے۔ اور ہونٹوں پر رس ہی رس تھا، کھٹا میٹھا۔

راجہ کچھ اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے اس کوشش میں ہو کہ اس کے
ذہن کو کچھ اچھا برا سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ ہوتا رہے

اور جو بھی ہونا ہے وہ ہو جائے۔

دو گھڑی ہی بعد ایک خوش رُو نوعمر لڑکا اپنے چھکیلے لباس پر شادابی فرحاں اپنے چہرے کی پوری معصومیت کو اپنی مسکراہٹ میں سمیٹے ہوئے خیمہ میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں سُرخ ڈوریوں سے سجا ہوا ایک ہلکا پھلکا چابک تھا اپنے ننھے خوبصورت ہاتھوں میں وہ نازک سا چابک تھامے راجہ کے سامنے باادب ایستادہ ہو گیا اور کچھ خوشی اور کچھ خوف کے ساتھ راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"آپ کا اسپ تازی تیار ہے۔"

راجہ نے بغور اُس نوعمر کی طرف دیکھا مسکرا پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک آ گئی اور اُسے جیسے کچھ گمان ہوا پھر یقین سا ہوا۔ نوعمر سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

لڑکے نے نظریں جھکائیں اور کہا۔ "میں بھائی ہوں۔"

راجہ کو لگا اُس کا دل ذرا یونہی دھڑک اُٹھا۔ پوچھا "بھائی؟۔ کس کا؟"

نوعمر نے تیزی سے کہا۔ "میری بہن مرزی کا۔" اُس نے آنکھیں جھکائیں۔ راجہ کی نظروں سے شفقت پھوٹ پڑی۔ اس نے دیکھا اور سوچا۔ "یہ چہرے کے نقوش۔ اُن پر چھوٹی عمر کی چمک دمک۔ کنجائی آنکھیں ہلکی سنہری پلکیں، سُرخ رخساروں پر جھلکی چھوٹی چھوٹی۔ بس ایسے ہی تیکھے نقوش ہوں گے۔ یہی چمک دمک ہو گی۔" راجہ نے مسکراتے ہوئے اُس نوعمر سے پوچھا۔

"یہ مرزی کون ہے؟"

"میری بہن۔" نوعمر نے جواب دیا۔

راجہ ہنس پڑا جیسے دیر سے وہ ہنسنا چاہتا تھا۔ آگے بڑھ کر لڑکے کے ہاتھ سے اُس نے وہ ننھا سا چابک لے لیا۔ چابک میں صندلی خوشبو تھی۔ نوعمر نے کہا۔ "آپ جو باہر چلیں۔ ندی کی طرف وہاں آپ نہا سکیں گے" لڑکا پلٹ گیا۔ اور راجہ اُس کے

راجہ نے نہاتے ہوئے جب بہتے پانی کو اپنے سارے بدن پر محسوس کیا تو اسے ایسا ہی لگا جیسے کوئی نرم و گرم جوان و گداز بدن اُس کے بدن سے لپٹ گیا ہے۔ گالوں سے گال مس ہو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر کوئی ہونٹ رکھ رہا ہے اور سینے پر جیسے نرم و گرم پُر جذبہ سا ہے۔ اور رانوں پر ایسے تھپیڑے لگ رہے ہیں کہ سارے بدن میں پانی آگ لگا رہا ہے۔

راجہ کچھ ایسے ہی پُر تلذذ احساسات کے ساتھ نہاتا رہا۔ جب نہا کر وہ ندی سے باہر آیا تو اُس کے دُھلے دھلائے، تر و تازہ اور سُرخ و سفید جوان جسم کے گٹھیلے پن کو دیکھ کر قریب کھڑے ہوئے سب مرد اور بچے آنکھوں میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔

دو لڑکوں نے آگے بڑھ کر ایک کشتی میں رکھا نیا نویلا لباس راجہ کے سامنے پیش کیا تو راجہ اپنی سنہری مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اسے ایک نئے قسم کا لباس پہننا پڑے گا۔ سنہرے تار کا بنایا ہوا ایک ڈھیلا ڈھالا کُرتا۔ ہلکی ریشمی سُرخ تہمد اور ایک خرمزی رنگ کی مخملی جیکٹ جس پر سنہرے پھول کڑھے ہوئے۔ سر پر باندھنے کے لیے ایک ریشمی پگڑی۔ سُرخی لیے ہوئے پہاڑی مضبوط جوتے۔ سارے لباس میں صندلی مہک۔

وہ لباس اُس نے جب زیب تن کیا تو اُس کا حُلیہ ہی بدل گیا۔ وہ بھی اُس قبیلہ کا ایک بڑا ہی خوبرو نوجوان دکھائی دینے لگا۔ اُس لباس کے پہننے کے بعد راجہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی مُسکراہٹ اور دمک، ایک صحرائی مزاج کی غماز بن گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ راجہ اپنے ماضی اور مُستقبل سے بالکل بے نیاز و بے خبر ہو گیا ہے اور اسے اُن بے حساب مسرتوں نے مالا مال کر دیا ہے جو مختصر ہوتی ہیں لیکن حال کی طرح اپنے مختصر ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ اُس کی نس نس میں جنگلی پھولوں کی

ساتھ ہو گیا۔

نیچے سے باہر ایک اسپ تازی سرخ و سبز باگ اور زین سے سجا کھڑا تھا۔ پشت پر مخملی غلاف تھا۔ گھوڑے نے تھوڑی سی گردن جھکائی جیسے تسلیمات بجا لا رہا ہو۔ راجہ کے باہر نکلتے ہی اچانک آسمان تک ایک گلرنگ منظر کھل اٹھا۔ راجہ کو لگا نہ یہ آفتاب کی روشنی ہے نہ چاند کی چاندنی۔ یہ رنگ و نور تو شاید کچھ نامعلوم ستاروں و سیاروں سے پھوٹ رہا ہے۔ راجہ کے سامنے کچھ صحت مند نوجوان اسے اپنے جلو میں لیے چلنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور دوسری طرف بہت ساری کھلتی، کھلکھلاتی جوانیوں کا ایک غول تھا۔ اس غول میں دو پھلجھڑیاں کیا چھوٹیں سارے چہرے کسی پُر لطف شرارت پر آمادہ نظر آئے۔ راجہ نے گھوڑے کی باگ تھام لی۔ رکاب میں اپنا پاؤں رکھا تو ایک کلی نے چہک کر کہا: "ارے پھسلا" سب ہنس پڑے۔ راجہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور ایک جلوس جس میں صرف نوجوان مرد اور نوعمر لڑکے تھے۔ ندی کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں ہر طرف سرخ و سفید پھولوں سے لدے لدائے پیڑ کھڑے تھے ہلکی ہلکی ہواؤں کے جھونکوں سے وہ نازک پھول سوار کے سامنے سے گر رہے تھے اور راستے پر پھولوں کی سیج بچھ رہی تھی

ندی کے آس پاس بھی اونچے اونچے گھنے پیڑ تھے۔ قریب ہی چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں۔ پہاڑیوں کا سایہ ندی پر پڑتا تھا۔ وہ اونچے پیڑ بھی ندی میں اپنے عکس کو دیکھ کر اپنے قد اور اپنی پُر بہار شخصیتوں کو دیکھ کر جھوم جاتے تھے۔ آفتاب کی کرنیں بھی ٹھیک اس مقام پر آ کر ایک ہالہ سا بنا دیتی تھیں جہاں پہونچ کر ندی جوان ہو جاتی تھی اور اس میں ایک شوخی اور الھڑپن آ جاتا تھا۔ اس کی رفتار میں دلربائی کے ساتھ وہ ادا بھی آ جاتی تھی کہ بہتا پانی پتھروں کو گدگدیاں کرتے ہوئے گذرتا تو پتھر ہنس پڑتے اور کبھی کبھی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ہر طرف پھولوں کا بستر تھا۔ خیمے پر بھی رنگین پردہ پڑا ہوا تھا۔ اور پردے پہ
پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ بزرگ اُسے خیمے تک لے گیا اور بولا۔ "آپ اندر چلیے اور
ہمارا انتظار کیجیے۔"

راجہ نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ پردے کے پاس سے مسند تک قالین بچھا ہوا
تھا۔ خیمے کے اندر گلاب کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔ جانے وہ کونسا مہربان و مشفق نوجوان
سورج ہوگا جو اپنی نیلگوں روشنی سے خیمے کو روشن کیے ہوئے تھا جیسے وہ بھی اتنا
پُر مسرت ہو کہ پھر اپنا فرض انجام دینے کے لیے وہاں آ گیا تھا۔ اس نیلگوں روشنی
میں ہلکی ہلکی حرارت تھی۔

راجہ کی نظر اس وقت مسند کے قریب ہی رکھی ہوئی ایک نقرئی صراحی پہ
پڑی تھی۔ اس کے قریب ایک خوبصورت پیالہ رکھا تھا۔ صراحی پر نظر پڑی تو راجہ کو احساس
ہوا کہ اُسے پیاس لگی ہے۔ صراحی اٹھا کر اس نے پیالہ بھرا۔ پانی نہیں تھا بلکہ کوئی ٹھنڈا
میٹھا شربت تھا۔ اس نے ایک پیالہ خالی کر لیا۔ سارے جسم میں اُسے ایک سرور محسوس
ہوا۔ خیمہ میں وہ اکیلا تھا۔ اپنے آپ پہ ایک بھرپور نظر ڈالی اور بڑے ہی پُرشکوہ
انداز میں تازہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسند پہ بیٹھ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے
یکلخت ہر طرف سناٹا چھا گیا ہے۔ ہر شے خاموش ہو گئی ہے۔ کہیں کوئی سانس تک
نہیں لیتا۔ بس جیسے اس بھرے پُرے جنگل میں صرف اُسی کا ایک خیمہ ہو اور باہر کچھ
نہیں۔ نہ وحشت و ویرانی، نہ ہنسی کی پھلجھڑیاں، نہ چہل پہل۔ کچھ ایسی خاموشی
کہ اُسے اپنی سانسوں کی آواز بھی تیز لگی۔ اس نے سانس روک لی۔ چند ہی لمحے میں
ایسی طویل و عریض خاموشی چھا گئی تھی۔ لگتا تھا روشنی بھی زیادہ ہو جاتی تو شاید
روشنی کی بھی آواز سنائی دیتی۔ پھر ایسے میں کچھ اتنی ہلکی سی آواز آئی جیسے
ہوا نکلے روشنی ہی پھیل گئی ہو۔ یا پھر ایک گمان سا راجہ کے ذہن سے یا ذہن سے۔

خوشبو بس رہی تھی اور اس آنکھوں میں ایک معطر معطر سا نشہ آ چلا تھا۔
ساتھ آتے ہوئے ایک شخص نے راجہ کے گلے میں تر و تازہ خنک پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور گھوڑے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ راجہ کی نظر گھوڑے پر پڑی۔ گھوڑا بھی خوشبودار پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ راجہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور آنے والے لمحات کی طرف بڑھنے لگا اس طرح کہ اگر ان لمحات کے آنے میں کچھ دیر ہو جائے تو وہ خود ان کی طرف تیزی سے بڑھ جائے۔

خیموں کے پاس پہونچنے سے پہلے ہی ڈھولکیوں اور نفیریوں نے آلیا۔ پھر قبیلہ کا وہ راہبر بزرگ آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ اور بھی بوڑھے بڑے قبائلی تھے اور ان سب کے پیچھے وہ شوخ و شنگ، سرخ و سبز، آسمانی اور دھانی اور قوس قزح رنگوں میں ملبوس جوانیوں کا گروہ تھا۔ بہتا کھیلتا ہوا۔

راجہ ان قبائلی بزرگوں کے پاس پہونچا تو اسی برف پوش بزرگ نے آگے بڑھ
رتھ سے اتر پڑا تو بزرگ نے اسے پہلے
اپنے گلے سے لگایا۔ باقی سب بزرگ کچھ گنگنانے لگے۔ پھر دو حسینائیں آگے بڑھیں اور راجہ کے سامنے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھیر دیں۔ نوجوان عورتوں کا سارا غول اب کچھ میٹھے سُروں میں گانے لگا۔ ڈھولک اور نفیر بہت زور سے بجنے لگے۔ بزرگ نے راجہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ آیئے"

اب راجہ ایک رنگ برنگے، گاتے گنگناتے، لہکتے لہراتے جلوس میں خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ اس خیمہ تک پہونچا جہاں سے نکل کر وہ ندی کی طرف گیا تھا تو اس نے دیکھا، وہاں تو بس پلک جھپکتے میں رنگوں کی ایک نئی فصل اُگ آئی تھی زمین پر چھڑکاؤ ہو گیا تھا اور ہر طرف پھولوں کی بے حساب پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں

کچھ فاصلے پر گذر گیا ہو۔ "چھن"۔ کانوں سے پہلے جیسے آنکھوں نے سن لیا۔ پردے پر راجہ کی نظر تھی۔ خیمہ کا پردہ اٹھا اور اس خاموشی کے بجھے چراغ سے جیسے آواز کا ایک شعلہ لپکا۔ ایک ہلکی جھنجھناتی ہوئی ہنسی ۔ دو سرو قد جوانیاں آئیں اور بس اتنا کہا۔

"ذرا سنبھلنا"۔

راجہ کو محسوس ہوا رنگ اور کہیں نہیں، صرف اُس کی نظروں میں ہے۔ پھر آہی رنگوں سے اُس کے خیمے میں ایک آگ سی لگ گئی۔ گلرخوں نے بڑے ہی ناز سے پوچھا۔

"پہچان سکتے ہو اس آگ کو؟"

راجہ کی آنکھیں مسکرا پڑیں تو آگ اور دہک اٹھی۔ راجہ کو ایک خیال آیا۔ جب گمان یقین بنتے ہیں تو شاید انسان کے اندر صرف روشنی ہی روشنی ہو جاتی ہے۔ کہیں اندھیرا نہیں ہوتا۔ ایک گل رخ نے چھیڑا۔ "ارے تمہاری تو زبان بند ہے۔"

دوسری نے کہا۔ "آنکھیں کہاں کھلی ہیں۔" تو دہکتی آگ بھی مسکرا پڑی ۔

ایک گل رخ نے ابرو کی کمان تان کر آگ سے کہا ۔ "اب جلدی سے تو ہی بول دے کہ تو کون ہے۔" لگا دہکتی آگ پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے اور ہلکی ہوا سے شعلہ لپک گیا۔ دوسری گل رخ نے کہا۔

"ہونٹ نہیں ہلتے تو کم سے کم اپنی آنکھیں تو ایک بار جھپکا کر دیکھ لے اپنے قبیلے کا ہی پلا ہوا لگتا ہے۔"

اس مجسم آگ کی سانسیں بکھر گئیں۔ پلکیں متحرک اٹھیں۔ آگ میں نمی سی آ گئی اور پھر جانے کس طرح ہونٹ ہلے۔

"میں مرزی ہوں"

"مرزی!! — میں راجہ ہوں۔"

"ارے یہ تو بولتا ہے" ایک ساتھ دونوں گل رخوں کی زبان سے نکلا اور تیزی سے

وہ مرزی کو سنبھالے خیمہ سے باہر نکل گئیں۔ اچانک باہر ایسا شور مچا جیسے کچھ دیر پہلے جو خاموشی تھی اُس پر آوازوں کی بارش ہونے لگی ہے اور اُن آوازوں میں ہر دل جھینگ رہا ہے۔ ہر دل جیسے خوشیوں سے جل تھل ہو گیا ہے۔

(۲۱)

اب سورج کی کرنوں نے سنہرے رنگ کا چھڑکاؤ شروع کر دیا تھا۔ جنگل کا ہر ذرہ ہر پتہ سونا بن گیا تھا لیکن اس سنہری چمک دمک سے زیادہ دلکش اور زیادہ قیمتی اُن چہروں کا تبسم تھا جو مسکرا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ گنگنا رہے تھے اور بہت ہی دلچسپ مصروفیت میں کھوئے ہوئے تھے جیسے ایک بڑی ضیافت کے انتظام میں لگے ہوئے ہوں۔ سب کے چہروں پر ایک ذمہ داری کا خوشگوار احساس تھا۔ وہ برف پوش بزرگ کچھ اور بزرگوں کے ساتھ، راجہ کے خیمہ میں داخل ہوا۔ وہ سب بہت ہی صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے تھے۔ راجہ اُن کے استقبال کے لیے اُٹھنے لگا تو برف پوش بزرگ نے کہا۔ "آپ بیٹھے رہیے۔ ہم لوگ آ رہے ہیں"

تب وہ بزرگ آگے بڑھ کر خود بھی مسند پر بیٹھ گیا اور راجہ کی طرف کچھ جھک کے اور اپنے جھریوں دار چہرے پر ایک پُرلطف مذاق کا اظہار لیے۔ بڑے ہی مدھم لہجے میں کہا "یہ ہماری رسم ہے، ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ بیاہ سے پہلے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ مجھے یقین ہے آپ کو یہ رشتہ پسند ہے۔"

پہلی بار راجہ کی آنکھوں میں ہلکا سا حجاب آیا اور اُس کا جی چاہا کہ اُس برف سے کے بوڑھے اور معصوم منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے یہ رشتہ پسند ہے۔"

اُ تب اُس خیمے میں کھڑے ہوئے تھے۔ ذرہ ذرہ ہر ایک نور تھا۔

لی ہوئے اور ہر تان میں ہر سُر میں

ایک عجیب درد سا ہوتا ہے ایک دوری ہوتی ہے ایک یاد ہوتی ہے، ہوک جیسی اور اس کی ایک ہلکی اونچی تان صحراؤں کو ہستانوں کو پھلانگ کر پل بھر میں وہاں پہونچ جاتی ہے یا سننے والوں کے دل و جان کو ساتھ لیئے زندگی کے ان گذرے خوابوں تک پہونچ جاتی ہے جہاں کوئی چھوٹی ہوئی یاد، اپنی بے زبانی، بے بسی اور لاچارگی لیئے اس طرح ٹھہری ہوئی ہوتی جبکہ دراصل وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا، بس ایک خلا ہوتا ہے لیکن پھر بھی شہنائی، بجتی بجتی خوشیوں کے لئے ایک درد کرب کے ساتھ یہ بتانے کے لئے کہ کوئی اپنے مامن و مسکن سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے

راجہ کے خیمہ سے باہر کسی نے شہنائی کی ایسی تان اٹھائی کہ ہنستے چہرو ں پر گھڑی بھر کے لئے کسی گہرے جذبے کا غبار سا چھا گیا۔ پھر جیسے سبھی، آنے والے لمحات کے استقبال کیلئے تیار ہو گئے۔ سب نے نظریں اٹھا کر خیمے کے پردے کی طرف دیکھا۔ شہنائی کی لئے اور تیز ہو گئی ۔

اچانک پردہ اٹھا اور خیمے کے اندر پھول برسنے لگے۔ شہنائی کی آواز پھولوں کی بارش، معطر جھونکے اور قریب آتی ہوئی دف کی آواز پردے کے پاس شور مچ گیا۔ خیمہ میں جمع لوگ سب اٹھ کھڑے ہوئے پھر خیمے میں کچھ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے در آئے۔ ان کے ہاتھوں میں گلاب اور موتیا کے پھول تھے۔ پھر ان سے پیچھے چمکیلے اور بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس لڑکے لڑکیوں کا ایک غول آیا۔ پھر بھی سب کی نظریں پردے پر لگی ہوئی تھیں۔ دف کی آواز بہت تیز ہو گئی شہنائی کی ایک اونچی تان اٹھی اور نظر . . والوں نے دیکھا کہ سنبل و یاسمن کے جلو میں ایک لالہ

بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ایک ضروری رسم کی ادائی کے بعد یہ دونوں بیاہ کے بندھن میں بندھ جائینگے ـــ ساتھ ہی افسوس کے ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ یہ بندھن کل صبح ٹوٹ جائیگا اور یہ دلہا دلہن ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائینگے ۔ ہم جانتے ہیں یہ ایک بہت بڑا بلیدان ہے لیکن یہ بلیدان ہمارے قبیلہ کی زندگی اور خوشحالی کے لیے ضروری ہے"

"اب ہم آپ سب گواہوں کے سامنے راجہ صاحب اور دلہن مرزی کو بیاہ کے بندھن میں باندھتے ہیں ـ"

اس اعلان کے ساتھ ہی بزرگ نے راجہ اور مرزی کے دامن پکڑے اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے ایک گرہ لگا دی ۔ پھر سب نے پھول برسائے ۔ اس کے بعد مرزی نے اپنے خوبصورت اور نازک ہاتھ میں سامنے رکھے طشت سے دیا اٹھایا اور راجہ کی آرتی اتاری۔ پھر پھولوں کا ایک ہار اٹھا کر راجہ کو پہنایا۔ راجہ نے بھی دوسرا ہار اٹھا کر مرزی کو پہنایا ۔ پھر دونوں نے تھوڑی سی مٹھائی ایک دوسرے کو کھلائی ۔ سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں ـ باہر باجے بجنے لگے ڈھولک، نفیری، شہنائی اور دف ـ بدھائی ہو" بدھائی ہو" کا شور مچ گیا ۔ نوعمر لڑکے لڑکیوں نے دلہا دلہن پر گلاب کی پنکھڑیوں کی بارش کر دی ۔ ہر طرف مٹھائی تقسیم ہونے لگی، سب کے منہ میٹھے ہو گئے کچھ نوجوان الھڑ دوشیزائیں جھرمٹ میں ٹھہر کر بڑی ہی شوخ اور تیز نظروں سے دلہا دلہن کی طرف دیکھنے لگیں کہ دیکھیں اب یہ دونوں کیا کرتے ہیں ۔ راجہ نے جب ان کی طرف نظر بھر کر دیکھا تو ان میں سے

گجرا لہلہا رہا ہے۔

دلہن اپنے بوجھ کو اپنے بے قابو پیروں پر سنبھالے ہوئے دوسری سہیلیوں کے سہارے مسند کی طرف بڑھ رہی تھی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے کچھ گا رہے تھے۔ دلہن جب مسند تک پہونچ گئی اور برف پوش بزرگ نے اپنی جہاندیدہ نگاہوں کو اٹھا کر دلہن اور دلہا کی طرف دیکھا تو بوڑھے منہ پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے دلہن کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر دلہا کے سامنے بٹھا دیا۔ اب سبھی نے دلہا دلہن پر پھول برسائے۔ راجہ کا چہرہ تو پھول کی طرح کھلا ہوا تھا لیکن اسکے چہرے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس کا دماغ اس کے ساتھ نہیں ہے اور وہ کچھ سوچ نہیں رہا ہے۔ چاہتا بھی نہیں کہ کچھ سوچے۔ اس وقت ایک طشت میں سجائے تازہ بہ تازہ پھولوں کے دو مہکتے ہوئے ہار پیش ہوئے۔ طشت میں ایک چھوٹا سا دیا روشن تھا اور کچھ پھل اور کچھ مٹھائی رکھی تھی۔ سب عورتیں اور مرد دلہا دلہن کے اطراف کھڑے تھے۔ شہنائی کی آواز یکلخت رک گئی۔ سب چپ ہوگئے۔ نظریں جھکالیں۔ برف پوش بزرگ نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اور کچھ دیر اسی طرح پڑھنے کے بعد دلہا دلہن پر گلاب چھڑکا۔ سب نے ایکبار پھول برسائے پھر بزرگ نے خیمہ میں جمع قبائلیوں اور دلہا دلہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آج ہمارے قبیلہ کی بیٹی مرزی کا بیاہ ایک نو وارد بہادر نوجوان راجہ صاحب سے ہو رہا ہے۔ اس بیاہ کو سارے قبیلہ کی خوشنودی حاصل ہو۔ یہ بیاہ اپنی مثال آپ ہے اس لئے کہ اس کی کچھ شرطیں ہیں جو دلہا دلہن نے مان لی ہیں۔ اسلئے اب میں ایک خوشی کیساتھ اس

ایک نے بڑی ناچی دیدہ دلیری سے پوچھا "اب آگے کیا ارادہ ہے"
پوچھنے والی کے رخساروں کا رنگ دیکھ کر راجہ کی آنکھیں جھپک گئیں۔
اس نے جواب دیا۔

"تمہارا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ
آگے میرا کیا ارادہ ہے"

الھڑ دوشیزائیں زور زور سے ہنس پڑیں۔ دلہن کے گھونگھٹ میں ہلچل
ہوئی تو ایک نوخیز لڑکی نے مرزی سے کہا۔

"تم تو سارے قبیلے کی استاد ہو۔ دیکھو یہ پردیسی بیچارہ کوئی
شکاری نہیں یہ تو خود شکار لگتا ہے تمہارا۔ ذرا گھونگھٹ اٹھا کر بتادو
کہ تم کیا ہو!"

اس پر ایک دوسری نے کہا۔ "آگ ہے آگ۔ غضب
آگیا ہو جس طرح دیکھو تو گلزار اور چکھو تو کیا انار" سب پھر زور سے ہنس پڑیں
راجہ نے کہا۔ "میرے تو منہ میں پانی آرہا ہے"

"پی ڈالو نہیں تو شک پڑیگا" ایک آواز آئی۔

اب تو مرزی کے بدن میں بھی لہریں اٹھنے لگیں۔ اسی وقت
ایک نوعمر بھاگتا ہوا خیمہ میں آیا۔ اور آکر سیدھے مرزی کا ہاتھ پکڑلیا
کہنے لگا۔ "چلو سب بلا رہے ہیں۔"

راجہ نے کہا "تو کیا میں بھی چلوں؟"

"ہاں، دونوں"

دوشیزاؤں نے آکر مرزی کو گھیر لیا۔ راجہ کی نظر اٹھی تو دیکھا
"کتنی کلیاں ہیں"

کتنے پھول ہیں، کتنے اودھ کدرے پھل ہیں اس کے قریب۔ اس دھرتی پر کتنی سندرتا ہوتی ہے۔ جو اس سے آگے عمر کی کیا ضرورت ہے۔"

دو شیرازئیں مرزی کو سنبھالے باہر چلی گئیں، تو گھر بستی کے کاہا تو راجہ نے تھام لیا۔ سب خیمے سے باہر آ گئے۔ ایک عجیب ہنگامہ تھا باہر۔ ایک نتھے ہیں سارے قبائلی کھڑے ہوئے تھے اور دف اور لنقیر والے سب کے بیچ کھڑے تھے۔ ایک کے پاس لمبی سی بانسری تھی۔ جب سب اپنا اپنا ساز بجانے لگے تو قبیلہ کی کچھ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے رقص کرنے لگے۔ رقص میں کیا نہ کچھ تھا۔ کتنے ہی رنگ تھے جوانی تھی، صحت تھی، لوچ تھا، کھاؤ تھا، قربت تھی، دوری تھی۔ پیار کا اظہار تھا اور عشوہ و ناز کی تنگ مزاجی تھی۔ شوخی تھی، خود سپردگی تھی۔ قبیلے کے بزرگ کچھ دور بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے تخت پر راجہ اور مرزی بیٹھے اپنے اپنے دلوں کی دھڑکنیں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شام بھی اپنی افقی سرخیوں میں ملبوس اس جنگل میں انسان کی طرح براجمان تھی۔ رقص کے بعد رقص بدلتا تھا۔ ایک گیت ڈوبتا تھا تو دوسرا ابھرتا تھا۔ ایک گبرو نے ایک پہاڑی تان ایسی لگائی کہ جنگل گونج اٹھا۔ قریب کی پہاڑیوں کے دل دھڑک اٹھے۔ سرخ پھولوں سے لدے پیڑوں کو ایک سرور آ گیا اور وہ جھوم اٹھے۔ وہ پہاڑی تان ہر بشر اور ہر شجر و حجر کے سینے کو چیر کر نکل گئی۔ تان میں سہاگ رات کا رنگ و رس تھا۔ پہلے ملاپ کی لذت تھی اجنبیت تھی۔ بھولا پن تھا اور ساتھ ہی ایک ہوک تھی۔ برہ کی۔

اس تان اور اس رقص کے بعد تو سارے ہی قبائلیوں نے ایک ہڑبونگ مچا دی۔ کیا بچہ، کیا بوڑھا اور کیا جوان، سبھی ناچنے لگے۔ سبھی گانے لگے۔ کچھ مرد آئے اور راجہ کو گھسیٹ لے گئے۔ کچھ عورتیں آئیں اور مرزی کو کھینچنے لگیں۔ پھر تو راجہ بھی ناچنے لگا اور مرزی بھی۔ سب ایک ہو گئے۔ ہر طرف گلال اڑنے لگا۔ دھماچوکڑی رقص کے بعد بعض عورتیں اور مرد ہنس ہنس کر نڈھال ہو گئے۔ فرش پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

راجہ اور مرزی پھر اس تخت پر آ بیٹھے۔ پھر لوگ اِدھر اُدھر اس طرح بکھر گئے جیسے کسی اہم کام میں مصروف ہو گئے ہوں۔ ضیافت کا انتظام ہونے لگا۔ گرم گرم دیگیں کھل گیئں، الائچی، زعفران کی خوشبو سے فضا مہکنے لگی۔ جنگل میں جا بجا فرش بچھنے لگے۔ راجہ کے تخت کے پاس بھی ایک سُرخ سُرخ فرش بچھ گیا۔ طعام سے پہلے اُس کو کوئی مشروب پیش کیا گیا۔ راجہ نے ایک پیالہ پیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت ہی صحت مند آدمی ہے اور اُسے شدید بھوک لگی ہے۔ جنگل میں جگہ جگہ فرش پر دستر خوان لگ گئے تھے۔ ایک بڑا سا قاب، اُس کے اطراف چینی کے برتنوں میں مُرغ و ماہی۔ پلاؤ، قورمہ اور مٹھائیاں ـــ راجہ کی اِشتہا کچھ اتنی تیز ہو گئی کہ مرزی سے زیادہ پُر کشش اُسے دستر خوان لگا۔ سارے قبائلی مرد اور ساری عورتیں اپنے اپنے دستر خوانوں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت برف پوش بزرگ نے راجہ اور مرزی کے قریب آ کر دونوں کو دُعا دی اور دونوں کو دستر خوان کی طرف آنے کے لیے کہا۔

طعام شروع ہو گیا۔ راجہ اور مرزی ایک ہی قاب میں کھا رہے تھے لیکن مرزی کا مہندی لگا ہاتھ اُٹھتا نہ تھا۔ وہ بس یونہی کسی بوجھ تلے جھکی بیٹھی تھی۔ ایسے میں وہی شوخ و چینچل لڑکیاں، جو مرزی کو پہلی بار راجہ کے خیمہ میں لے آئی تھیں، آگے بڑھیں اور مرزی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھانے لگیں۔ ایک نے راجہ سے کہا۔

"راجہ جی، رانی کو بھوکا مت مارو، چھوڑ دو اسے۔ ہم اُس کے چہرے کی نقاب نکال پھینکنے کے بعد اُسے واپس لاتے ہیں۔" یہ کہہ کر لڑکیوں نے مرزی کو آہستہ سے اُٹھا لیا۔ اور ساتھ لیے ایک خیمے میں چلی گئیں۔ دوسری طرف سے برف پوش بزرگ راجہ کے پاس آ بیٹھا اور بڑی شفقت سے وہ راجہ کی تواضع کرنے لگا۔ راجہ نے شاید ہی کبھی اتنا خوشبودار کھانا کھایا ہوگا۔ وہ بہت ہی مسرور لگتا تھا۔ دوسری طرف اُس خیمے سے جہاں ساتھی لڑکیاں لے گیئں تھیں۔ شوخ و شنگ قہقہوں کی آواز

آرہی تھی۔

طعام کے بعد وقت کے رنگ بدلنے لگے۔ شام کے ہلکے سنہرے اُجالے، سرمئی ہونے لگے ہواؤں میں موتیا کی خوشبو رچنے لگی جنگل اور سہانا ہو گیا۔ لوگ مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور پھر گیت شروع ہوئے۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے پیڑ کے پتے ہلکے ہلکے ہلنے لگے۔ گیتوں کے سُر گہرے ہونے لگے۔ تانیں ہر سی دور رس معلوم ہونے لگیں۔ سننے والے سب سر دُھننے لگے۔ چند الھڑ دوشیزاؤں کے ایک گروہ نے اچانک ایک بدا کا گیت شروع کر دیا۔ دھیمے سروں میں۔ ہلکی ہلکی ہواؤں کے مدھم ساز پہ۔

سب کی آنکھیں جھک گئیں اور گیت آگے بڑھنے لگا۔ اب خیموں میں دیئے جلنے لگے۔ خیموں سے باہر دو تین گیس بتیاں جلائی گئیں۔ جنگل پُر اسرار ہونے لگا۔ خیمے خیال بننے لگے اور جنگل خواب۔ شام اپنے اسرار سے باخبر ہو کر رات کا ریشمی دامن تھامنے لگی۔ بدا کا گیت گہرائیوں میں اترنے لگا۔ تب قریب ہی کے ایک خیمے سے دو شعلہ رُخ لڑکیاں اپنے رُخِ زیبا سے نور برساتی ہوئی نکلیں اور ساتھ ایک چمکتے دمکتے رنگوں کی گٹھڑی ہاتھوں میں لیے بڑھنے لگیں۔ گٹھڑی پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بدا کا گیت وادیوں تک پہونچ چکا تھا۔ جنگل کا ذرہ ذرہ مرزی کو بدا کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں گیت گانے والی لڑکیوں کے گلے رندھ گئے۔ اُن کی لوچ دار آواز میں اب ایک گہرے درد کا اظہار آگیا۔ جنگل بھر کا درد۔ سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کچھ بوڑھی عورتوں نے مرزی کو گلے لگایا۔ مردوں نے دعائیں دیں اور سب اُسے ساتھ لیے راجہ کے خیمے تک آئے پھر مرزی کو اُس کی سہیلیاں خیمے کے اندر لیکر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد گیت تھم گیا اور سب خاموش ہو گئے۔

برف پوش بزرگ کے ساتھ ساتھ کچھ اور بزرگوں نے راجہ کو اپنے گلے لگایا۔ اُس وقت شہنائی بج اٹھی۔ اب راجہ اپنے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔ تنہائی جنگل میں

گونجنے لگی۔ خیمے کا پردہ اُٹھا کر راجہ خیمے میں داخل ہو گیا۔

خیمے کے اندر روشنی مدھم مدھم تھی۔ مسند کی جگہ اب ایک مسہری رکھی تھی۔ مسہری پہ پھولوں کی سیج تھی۔ فرش پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ خیمے کے اندر قدم رکھنے کے بعد راجہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت دیر بعد اب اُس نے سانس لینا شروع کیا ہے۔ اُس کی ہر سانس میں خوشبو تھی، پھولوں کی، عطر و عنبر کی۔ مہندی کی، چمکتے رنگین ملبوس کی۔ لب و رخسار سے پھوٹنے والی مستیوں کی۔ اسے مسلسل ایک نشہ چڑھ رہا تھا۔ اس بات کا اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی سیدھی بات نہیں کر سکے گا۔ اُس کو اپنے آپ پر اب کوئی قابو نہیں ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی آنچ ہے اور حلق و زبان پہ ہر لمحہ تشنگی کا بڑھتا ہوا احساس ہے۔

اُس نے پیچھے پلٹ کر خیمے کے پردے کے بند باندھ دیئے۔ پھر جو اُس نے اندر نظر ڈالی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ سچ مچ وہ اُس دیش کا راجہ ہے اور یہاں کی ہر شے اُس کی غلام ہے اُس کی اپنی ملکیت ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے وہ گلابی، شہابی، نیلے اور اودے پھولوں کی پنکھڑیوں سے بنی جو گٹھری سی رکھی تھی وہ ہلکی ہلکی آوازوں سے مسلسل سرگوشیاں کر رہی تھی۔ "مجھے چھو لو، مجھے پکڑو، مجھے اُٹھا لو، تو ہر طرف پھول ہی پھول بکھر جائیں گے"

مرزی نے آج سرِ شام جو ایک دزدیدہ نظر سے راجہ کی طرف دیکھا تھا وہ ایک نظر راجہ کے بدن میں خون کے ساتھ اُس کی رگ و پے میں اُتر رہی تھی۔ اب وہی نظر حجاب و حیا سے بھی پلکوں سے ہو کر راجہ تک پہونچنے والی تھی۔ جب وہ نظر اُٹھے گی تو کیا ہو گا؟

راجہ آہستہ، نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"ہمارا ساتھ صرف ایک رات کا ہے۔ یہی ایک رات ہم دونوں کی زندگی ہے۔ راتیں تو زندگی میں بہت ساری آئیں گی، لیکن ایسی انوکھی رات، اتنی عجیب رات

کسی کو ہزاروں زندگیاں بھی مل جائیں تو شاید نصیب نہ ہو ۔ آؤ ۔ دیکھو نا ۔ ہمارے پاس ہر لمحہ اپنی جگہ لعل و گوہر سے کم نہیں ۔ چلو جتنے چاہیں سمیٹ لیں ۔"

راجہ نے مرزی کا گھونگھٹ اٹھانا چاہا تو گھونگھٹ اور لمبا ہو گیا ۔ راجہ کو ہنسی آ گئی ۔

"چند ہی گھنٹوں کی تو رات ہے ۔ اس میں دو گھنٹے گھونگھٹ اٹھنے میں لگ جائیں گے تو باقی رات کے اندھیرے ہماری ساری زندگی کو کس طرح روشن کر سکیں گے ۔ میں تو نشے میں ہوں، بہت ساری پی لی ہے ۔ لگتا ہے نا؟ ۔

گھونگھٹ ہی جیسے ہنس پڑا ہو ۔

راجہ نے کہا ۔ "نہ آج تک میرے پاس کوئی دُر تھا نہ کوئی درد ۔ لیکن آج رات گذر رہی ہے تو ایک درد سا محسوس ہو رہا ہے اور رات کے ختم ہو جانے کا ڈر ہونے لگا ہے" کہتے ہوئے راجہ نے جب گھونگھٹ اٹھایا تو اسے لگا، وہ ایک خوابوں کی دنیا میں اتر رہا ہے ۔ نہ کبھی دھرتی پر اس نے ایسے پھول دیکھے تھے نہ آسمان سے جھانکتے ہوئے ایسے ماہتاب، رنگ و نور کا یہ وصال، عصمت، حسن و شباب کی وہ تر و تازہ کلیاں، مدھم مدھم، روشن روشن ۔۔۔ روح و بدن کی بے قراریاں، معدوم ہوتے ہوئے فاصلے، نرم و نازک لمس کے جلتے ہوئے چراغ ۔ چراغوں کی بھڑکتی سنبھلتی لوئیں ۔ دہکتی نظروں کی روشنی سے ماحول منور ۔ آہستہ سے جیسے ان روشنیوں نے گنگنانا شروع کر دیا ہو ۔ بڑی ہی بھاری سانسوں تلے مرزی کی آواز ابھری ۔

"مجھے معاف کر دو ۔ مجھے اس رات کی ایک ایک گھڑی کا احساس ہے ۔"

"لیکن گھونگھٹ اٹھنے میں آدھی رات گذر گئی ۔" راجہ یہ کہہ کر ہنس پڑا ۔

"بس دو گھڑی مجھے سنبھلنے دو ۔ پھر میں اپنا دل کھول کر تمھیں سب کچھ بتا دوں گی اور تم پہ نچھاور ۔۔۔" ایک ہلکی سی سسکی سنائی دی ۔ "اُف میرا کیا دوش تھا ؟ ۔۔۔"

کڑی سزا!"

راجہ کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ مرزی کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس نے پوچھا۔

"کیوں، اس رات کو تم سزا کہتی ہو؟ سچ بتا دو! میں تمھیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا میں تمھارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

مرزی کی آواز ڈوب گئی۔ اُس نے بڑے ہی دل گیر لہجے میں کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔ تم مجھے معاف کر سکتے ہو۔ لیکن ...."

"لیکن کیا؟" راجہ نے پوچھا؛

"لیکن میں تم کو عمر بھر معاف نہیں کر سکوں گی۔ تم مجھے کل بھلا سکتے ہو۔ لیکن تم مجھے کچھ اتنے اچھے لگے ہو کہ آج کے بعد یہ رات ایک بہت بڑا زخم بن کر میرے ساتھ رہے گی۔ اُف" کہتے ہوئے مرزی نے پھولوں کی سیج پر ایک کروٹ لی جیسے راجہ سے بے پناہ پیار کا اظہار کر دیا ہو۔ اور اُسے یقین ہو گیا ہو کہ راجہ کے بھی ایک گہری چوٹ لگی ہے۔

"اسے رات نہ کہو۔ یہ تو وقت کا وہ رُخ ہے جسے شاید ہی کبھی دھرتی نے دیکھا ہو" راجہ نے نرم لہجے میں کہا۔

مرزی نے پھر کروٹ بدلی۔ اپنی بیری بڑی آنکھوں سے راجہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تمھارا نام بھی تو بہت پیارا ہے 'راجہ'۔ جگ سارا تمھارا ہے نا؟ میں کیا چیز ہوں۔ ہونہہ۔ ایک ایک لفظ کہہ رہی ہوں تو لگتا ہے ایک ایک گھڑی سے محروم ہو رہی ہوں۔ لیکن تم جیسا راجہ مل ہی گیا ہے تو اب زندگی کو اور کیا چاہیے۔ بچھڑنے سے پہلے ایک ایسا بھرپور وار کر دو کہ کل کا سورج ہی نہ دیکھوں۔ بس ہمیشہ کے لیے تمھاری اس بھرپور آغوش میں سو جاؤں۔"

راجہ نے اپنا ہاتھ مرزی کے سرخ ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھ کی مضبوطی کا

ہونٹوں کی نرمی سے گھائل ہو گئی۔ مرزی نے راجہ کے ہاتھ کو اس طرح چوم لیا۔ جیسے دنوں کی تشنگی کو دو قطرے پانی مل گیا ہو۔

راجہ اچانک مرزی پر جھک گیا۔ مرزی تڑپ اٹھی اور راجہ سے اس طرح جا لگی جیسے چاہتی ہو کہ اُس کے وجود میں کہیں ہمیشہ کے لیے چھپ جائے۔

تب گذرتے لمحوں کی آواز آنے لگی۔ بالکل ہلکی سی۔ جیسے چلتے چلتے وہ لڑکھڑا رہے ہوں اور سنبھل رہے ہیں۔ چھن سے مرزی نے ایک بوجھل سی سرگوشی میں کہا۔" ذرا ٹھہرو۔" راجہ کی باہوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی تو مرزی نے اپنی نشیلی آنکھیں اس طرح کھولیں جیسے ایک لبالب جام اُس نے راجہ کے ہونٹوں سے لگا دیا ہو۔ مرزی نے کہا۔"راجہ میں نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ ٹھہرو۔ میں کچھ اتنی شرم و حیا کی ماری نہیں ہوں۔ میں تو جنگل زادی ہوں۔ دو چھن کا نقصان برداشت کر لو۔ میں قبائیلی لڑکی ہوں، تم سے پوری وفا کروں گی۔"

جس طرح ایک تیر کمان سے نکلتا ہے، مرزی راجہ کی باہوں سے نکل پڑی۔ خیمے کے ایک کونے تک پہونچی اور اپنے سارے سراپے کو سنبھالا۔ مہکتی زلفوں اور سجیلے ملبوس میں اُلجھی ہوئی کلیوں اور پنکھڑیوں کو فرش پر جھٹک دیا اور متبسم نظروں سے ایک بار راجہ کی طرف دیکھا جیسے کوئی فطری شوخی یا شرارت عود کر آ گئی ہو۔ کونے میں چھپی ہوئی ایک صراحی نکالی اور اُس کے ساتھ دو پیالے۔ پھر شبِ وصال کی لجاجت میں قبائلی الھڑپن کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے راجہ کی طرف بڑھی اور جنگلی پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی راجہ سے بولی۔

"یہ وہ زہر ہے جو میں تمھارے ساتھ پینا چاہتی ہوں اور مرنا چاہتی ہوں۔"

"تو لاؤ، پہلے مجھے پلا دو۔ میں تو مر چکا ہوں شاید زندہ ہو جاؤں"، راجہ کی اس بات پر مرزی پہلی بار کھل کر ہنسی۔

"راجہ سچ مانو، مرد کی بے جگری پر تو میں مر مٹتی ہوں۔ تم پر تو میری جان نچھاور ہوگئی — لو — یہ پیو اور مجھے پلاؤ۔ ہم آج خوب پی لیں گے اور پھر اس دھرتی اور اس آسمان کو، یہاں کی ہر چیز کو بھول بھال کر ایک دوسرے میں دفن ہو جائیں گے۔"

پہلی بار مرزی راجہ سے والہانہ طور پر چمٹ گئی۔ صراحی ایک طرف لڑھکتے لڑھکتے بچ گئی۔ لیکن اس بے فرصتی میں بھی چھلکتے ساغر پر راجہ نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور ایک کسمساتا، تڑپتا، نازک و زرتار بدن اپنی بے بسی کے نشے سے سرشار ہونے لگا۔

"دو گھڑی فرصت دو، دو گھڑی — پھر ساری زندگی لے لو۔"

مرزی نے ایک صراحی اٹھائی اور دونوں پیالوں میں شراب بھر دی۔ لبالب بھرے پیالے اٹھا کر دونوں نے پہلے سلگتی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر پیالے دونوں نے ایک دوسرے کے ہونٹوں سے لگا دیئے اور خالی کر دیئے — پھر ایک ایک پیالہ دونوں نے ایک دوسرے کو پلایا۔ راجہ نے مرزی سے کہا۔

"مرزی، پہلے پیا جو نشہ تھا، میں اسی سے بے قابو ہو چکا تھا، مجھے تو صرف تم نظر آ رہی ہو، صرف تم — تم سمجھتی ہو نا؟" پھر سرگوشی میں کہا۔ "اب تمھارا لباس نظر ہی نہیں آتا۔"

مرزی کے اندر ایک شعلہ لپکا۔ لیکن اس نے بھی دھیمے لہجے میں کہا — "تمھاری آنکھیں تو بند ہیں۔"

"نشیلی آنکھیں بند ہوں تو زیادہ نظر آتا ہے۔ بہت دور تک، یہاں تک —"

مرزی نے راجہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ایک پیالہ اور پی لو راجہ —"

راجہ نے جواب دیا — "لیکن تم یہ کیسے کہہ رہی ہو؟ میں کہاں ہوں؟ مجھے تو تمھارے سوائے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں تو آپ کو نظر نہیں آ رہا ہوں — صرف تم ہی تم ہو — میں تو جیسے کوئی گہرا بادل بن کر ہواؤں میں گھل مل گیا ہوں۔"

جو زندگی کے ہر ارمان کے لیے دل کے کواڑ کھول دیتی ہے۔ پچھلی رات کی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں اُن کے سارے ارمانوں کو اپنے ساتھ اڑا لے گئیں۔ مرزی اور راجہ دونوں ایک دوسرے کو سنبھالے اُس سبزہ زار پر دوڑنے لگے۔ ایک ایسا سبز و خنک مقام آیا کہ دونوں دانستگی و وارفتگی کے عالم میں گر پڑے۔ لوٹ پوٹ ہو گئے ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ گئے کہ اُن کے جسم کہیں بھی ایک دوسرے سے الگ نہ تھے بالکل ایک ہو گئے۔

مرزی نے اوپر کی طرف دیکھا وہاں پہاڑی سے کچھ ہی اوپر چاند معلق تھا۔ "چلو چلو یہ رقیب روشن رو، ابھی ابھی پہاڑی کے پیچھے چلا جائے گا۔" راجہ کا ہاتھ پکڑ کر مرزی نے کھینچا۔ اور دونوں بےتحاشہ دوڑنے لگے۔ ندی پر پہاڑی کا سایہ پڑ رہا تھا۔ ریت پھر بھی چمک رہی تھی۔ اُس کی ٹھنڈک پیروں کو چیر کے لگا رہی تھی۔ ریت پر لڑکھڑا کر چلتے ہوئے، مرزی اور راجہ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے گیلی ریت پر لوٹ پوٹ گئے۔ اُن کو لگا کہ کانچ کی بنی وہ رات ٹوٹ گئی ہے۔ اور گذرتے لمحوں کی کرچیاں اُن کے بدن کو لہولہان کر رہی ہیں۔ وہ دونوں اپنی مدہوشی میں ایک دوسرے کے بدن پر پھیلی ہوئی سُرخی کو دیکھتے رہے اور ہلکی چاندنی اُن زخموں میں جلن پیدا کرتی رہی۔ دونوں آہ بھرتے اور اُن کی آہوں کو ندی کا پانی اپنی لہروں کے ساتھ بہائے جاتا۔

پہاڑی کا سایہ گہرا ہو گیا۔ اُن کے سرخ زخم سیاہ ہو گئے۔ مرزی تڑپ کر اُٹھ بیٹھی دیوانگی کے عالم میں راجہ کو اپنی طرف کھینچ کر بھینچ لیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر نظر ڈالی۔ چاند نیچے اُتر رہا تھا۔ مرزی چاند سے بنتی کر رہی تھی۔ ذرا ٹھہر جا۔ اب اس سے آگے نہ کوئی زندگی ہے نہ موت۔ ہم جی بھی گئے اور مر بھی گئے۔"

راجہ نے مرزی سے کہا۔ "تم ایک جنگلی زادی ہو۔ بس مجھ پر ایک کرم کر دو۔

ایک چھرا لاکر میرے سینے میں گھونپ دو۔ بس!

اچانک چاند پہاڑی کے پیچھے اتر گیا۔ جیسے کسی نے رات کے سینے میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ چھرا ٹھیک سینے میں اتر گیا۔

رات دو روشن روشن دنوں کے بیچ کس طرح محفوظ رہتی ہے۔ کیسے رہ پہلے اور سنہرے دروازوں کے پیچھے بند رہتی ہے ایک ہی بار وہ در، وا ہوتے ہیں۔ رات سج دھج کر آجاتی ہے اور وقت کی تقدیر بن جاتی ہے۔ ایک طرح لیتی ہے اور پھر وقت کے ساتھ لافانی ہو جاتی ہے۔ عیش و نشاط سے بھرپور یا غموں سے چور چور۔

"چلو راجہ، نہ تم پوچھو نہ میں پوچھوں کہ ہم کیا یاد رکھیں گے چلو چلیں۔ بس، کبھی زندگی میں تم نے مجھے اتنا ستایا کہ میں تمہارے غم کو برداشت نہ کر سکوں تو ایک خنجر یا زہر کا پیالہ لیے تمہیں ڈھونڈوں گی۔ تم تک پہنچوں گی۔ تمہارے سینے میں خنجر گھونپ دونگی یا پھر تمہیں زہر کا پیالہ پلا دونگی۔

راجہ کی آنکھوں میں بلا کی سرخی تھی۔ جیسے خون تھا نہیں تھا۔ جیسے کسی طوفان نے سر اٹھایا تھا اور اچانک کہیں ختم گیا تھا۔ اپنے لہجے کو اپنی پوری قوت کے ساتھ سنبھالے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں نہ ہم اس ندی کے ساتھ ہو لیں جو اس کی منزل وہ ہماری منزل۔"

پھر جانے کیوں اس عجیب سے لمحے پر دونوں زور سے ہنس پڑے اور ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے خیموں کی طرف دوڑنے لگے۔ دلوانگی، دارفتگی، بے خبری، یہ سب مل کر شاید ایک راہ بناتی ہیں چل پڑنے کے لیے۔ جب کہ درد حد سے سوا ہوتا ہے تھوڑی دیر تو شاید ان کو کچھ نظر نہیں آیا، نہ پودے نہ پیڑ، جنگل میں گرتے پڑتے تو جیسے کب کے اڑ چکے تھے۔ یہاں سے وہاں تک نظر میں بے کھٹکے چلی جاتی تھیں چاندنی تو ایسی سمٹ رہی تھی جیسے کوئی دوشیزہ وصال

لگن۔ مجھے اس سے بچا لو راجہ۔ اُس کی آنکھیں جیسے پھر سے بے رنگ ہو گئیں۔ وہ
راجہ کے قدموں پہ گر پڑی۔

خیمے سے باہر ہوا کچھ ایسے جیسے کسی نے آواز دی ہو۔ دُور کہیں جیسے ناقوس
بج اُٹھا ہو۔ کسی معبد کو جگانے کے لیے گھنٹہ بج اُٹھا ہو اور ایسے ہی جنگل
کی ہواؤں نے اور جنگل کے پھول پات نے مل کر بھگوان کے نام کا کیرتن گانا شروع
کر دیا ہو۔

جوان دلوں کے جذبات کی آگ میں جلی ہوئی خواہشات کی راکھ، جس میں عنبر یا
خوشبو تھی، ہوا میں اُڑنے لگی۔ وقت کے کالے بدن پر کوڑھ کے دھبوں کی طرح
سفیدی پھیلنے لگی۔

راجہ نے کہا۔ "مرزی، میں پھر آؤں گا۔"

"نہیں راجہ، میں آؤں گی۔ تیرے پاس۔ تیری بیاہتا نہ سہی۔ تیرے لیے داسی
بنتا جاؤں گی۔ مگر آؤں گی اور تیری ساری زندگی لوٹ لوں گی۔"

خیمے کے اندر مرجھاتے ہوئے پھولوں کی سیج پر بیٹھے، دونوں طے کرنے لگے
کہ اُن کو کس طرح مرنا چاہیے اور کہاں۔

دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی ہی غضبناک نظروں سے دیکھا۔ دونوں نے
ایک دوسرے کو زہر کے پیالے پیش کیے۔ دونوں نے غٹاغٹ سارا زہر پی
لیا اور بے سُدھ ہو گئے۔

خیمے کے باہر سے کسی نے دبی آواز میں مرزی کا نام لیا۔ ایک مرزی کے
سینے پر خنجر آ لگا۔ مرزی تڑپ کر رہ گئی۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل پڑی۔ سیج
کے پھولوں پر خون ٹپکنے لگا۔ پھولوں سے خون رسنے لگا۔ اُس خون کو دیکھ کر
راجہ اور مرزی دونوں ہنس پڑے۔ زور سے ہنس پڑے، صرف اِس کوشش میں

کہ وہ خون جو اُن کے سینوں میں جم رہا تھا، بہہ نکلے۔

اُن کی ہنسی پر خیمے سے باہر بھی کچھ تازہ کلیاں بہ آواز بلند خنداں ہوئیں۔ شہنائی بج اٹھی۔ وقت کے سینہ میں درد چمکنے لگا۔ روشنی پھیلنے لگی۔

نوجوان آئے، بزرگ آئے۔ بڑی بوڑھی عورتیں آئیں، کچھ نازنینوں نے بدھاوا گیت چھیڑ دیا۔ دو تین نے اچانک خیمے کا پردہ اٹھایا اور تازہ پھولوں کے ہار لیے داخل ہوئیں۔

"یہ کیلے سانپ ہیں جن کے زہر میں خوشبو ہے۔ ڈسنے کی ضرورت ہی نہیں بس خوشبو ہی سے آدمی کا جگر خون ہو جاتا ہے۔" راجہ نے سوچا۔

دو لڑکیوں نے آگے بڑھ کر مرزی کے ہاتھ پکڑے اور اپنی آنکھیں جھکالیں۔ اچانک سبھی کی آنکھیں جھک گئیں۔ راجہ نے نظر اٹھا کر سب کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ راجہ کو خیال آیا کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ دیکھا تو مرزی کی آنکھیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ راجہ کو محسوس ہوا کہ پہلی بار اُس نے آنکھیں کھولی ہیں اور اپنے ماحول کو دیکھا ہے۔ ورنہ وہ تو اب تک ہر چیز کو صرف مرزی کی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے سوچا۔ یہ سب لوگ کون ہیں؟ یہ کونسا خواب تصویر بن گیا ہے؟ نہ کوئی کچھ کہتا ہے نہ میری طرف دیکھتا ہے۔ یہ سب بُت ہیں اور میں اکیلا آدم زاد۔"

ایک عجیب سکوت تھا، جو شاید کئی بے آواز اور ٹوٹی پھوٹی چیخوں سے بنا تھا۔ سفید ریش بزرگ آگے بڑھا اور راجہ کو سینہ سے لگا لیا۔ دوسرے بزرگ کچھ گنگنانے لگے جیسے دعائیں دے رہے ہوں۔ ایسا لگتا تھا یہ سب اب کہیں زمین پر نہیں بلکہ آسمانی رنگوں کی بنی چار دیواری میں کھڑے ہیں۔

مرزی نے نظر اٹھا کر دیکھا تو راجہ کو بھی محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں کا کوئی

گرم گرم آنسو اس کی اپنی آنکھوں میں تیرنے لگا ہو۔ دونوں کے ہونٹوں پہ جیسے کچھ ان کہے الفاظ کا بوجھ آن گرا تھا۔ ہونٹ ہل نہیں سکتے تھے۔ پھر مرزی کی شبھی سکھیوں نے مرزی کی آنکھوں میں جذب ہوتے آنسوؤں کو اپنے سینوں میں بہتے ہوئے محسوس کیا۔ مرزی کو وہ سب لے چلیں"۔

کچھ اس طرح اچانک ماحول میں روشنی پھیل گئی جیسے ایک شعلہ کی طرح سمیٹ لپکا اور آسمان پر ایک مقام تک آکر ٹھہر گیا۔ سب کو دیکھنے کے لئے۔

سفید ریش بزرگ نے راجہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ کے لمس سے جذبۂ تشکر ٹپک رہا تھا۔ بزرگ نے کہا۔

"آپ کا یہ بلیدان، آپکی یہ دلاوری، اس قبیلے کی ہر نسل کو یاد رہے گا۔ اب یہ قبیلہ آپ کو ایک دیوتا مان کر پوجے گا۔ اور ہر سال یہ دن آپ کی یاد میں منایا جائے گا۔ آج سے ہم جی اٹھے ہیں"۔

بزرگ نے دوسرے بزرگوں اور نوجوانوں سے کہا۔ "بولو، بولو... بولو"

سب کچھ گنگنانے کے انداز میں کچھ الفاظ دہرانے لگے۔

راجہ مسکرانے لگا۔ اُف ان سب نے مل کر اپنے دیوتا کو کتنا بڑا، کتنا گہرا اور کتنا ٹیڑھا، ترچھا زخم لگایا ہے۔ کتنا تازہ ہے زخم۔ تازے زخم کی تکلیف کا احساس کتنا کم ہوتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے جب وقت اُسے سُر یدنے لگتا ہے تو ہر سانس ایک زخم لگتی ہے۔ ان خیالات کے جاگتے ہوئے درد کے احساس سے راجہ کا سینہ تن گیا۔ اس نے پھر سب پر نظر ڈالی۔ ایک بار وہ پھر مسکرا پڑا۔ اتنا بڑا انتقام! مجھ سے؟ کس بات کا؟

راجہ نے بزرگ سے کہا۔ "مجھے شاید اب چلنا چاہیئے۔" سب بزرگوں نے اپنی خاموشی سے اعلان کیا۔ "ہاں"۔

ایک ڈھکی ہوئی طشت اُس کی طرف بڑھا دی۔ مرزکی نے طشت پہ سے سنہرے تاروں
سے بنا ہوا کپڑا اٹھایا۔ سب کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ مرزکی نے اُس میں رکھی
ہوئی ایک انگوٹھی اٹھائی۔ انگوٹھی میں نگا ہیرا سچا تھا۔ ایک بڑے قبیلے کی
ایک قیمتی نشانی۔ ایک شہزادی کی قیمت ـــــ یہ رسم کس قدر سستی ہوتی ہے۔ مرزکی نے انگوٹھی
آگے بڑھا کر راجہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بنا کسی احساس کا اظہار کیے انگوٹھی پہنا دی۔
ایک ساتھ دو بجلیاں کوند گئیں، بنا کسی جھگڑاہٹ کے، بنا کسی آواز کے۔ دونوں بجلیاں
تڑپ کر ان دیکھے گہرے بادلوں میں کھو گئیں۔

سفید ریش بزرگ نے راجہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "ہم سب کو شما
کرنا۔ اور ہم سب کو بھول جانا۔ ہماری آپ سے یہی بنتی ہے۔ بس سمجھ لینا کہ یہ
قبیلہ صرف ایک رات کے لیے اس دھرتی پر اُترا تھا اور آج صبح فنا ہو گیا۔"

راجہ کے گھوڑے کی زین سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ راجہ کا پہلا قدم ایسے
بڑھا جیسے وہ پیچھے ہٹ رہا ہو۔ اُس نے رکاب میں پاؤں رکھا۔ جانے یہ کیسا سکوت
تھا۔ کیسی خاموشی تھی، کیسا سناٹا تھا کہ سبھی کو ایک کہرام سا سنائی دے رہا تھا۔ پھر وہ
کہرام سمٹ کر ایک ہلکی سی ہچکی بن گیا۔

مشرق کی طرف ایک غبار اُٹھا۔ سورج دو ٹکڑوں میں کٹ گیا۔ تھوڑی ہی
دیر میں آدھی دھرتی پر آدھا سورج چمک رہا تھا جو اپنے محور سے بھٹکا ہوا لگتا
تھا۔

(۲۲)

راجہ کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھے سفر کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ کوئی خوشنما منظر تھا نہ ٹیڑھا میڑھا راستہ سیدھے صاف راستے میں نہ کوئی رکاوٹ تھی نہ کوئی لطفِ سفر۔ بس سپاٹ راستہ تھا جو گھوڑے کی رفتار سے زیادہ تیزی سے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

راجہ کو تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ سورج ٹھنڈا ہے یا ہوا گرم۔ اس کے ذہن میں اٹھنے والا ہر خیال پسینہ بن کر اس کے بدن پر تیر جاتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نہ بادلوں کی سیاہی تھی نہ اس کو یاد و باراں کا احساس تھا۔ ایک سفر تھا، خلاء میں۔ نظروں کے خلا میں، جس میں کوئی رنگ تھا نہ نور۔

گھوڑا اچانک ایک جگہ رک گیا۔ سامنے ایک بہت بڑا اور گھنا پیڑ تھا۔ ستھرے پانی کا ایک چشمہ تھا۔ راجہ کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا اور چلوؤں میں بھر بھر کر چشمہ کا پانی پینے لگا۔ وہ اتنا پانی پی رہا تھا جیسے اس کو یہ اندیشہ ہو گیا ہے کہ اس کے بدن کا ہر رگ و ریشہ خشک ہو گیا ہے اور پانی سے اسے اپنے سارے بدن کو سیراب کرنا ہے — یہ کیسی پیاس ہے جو بجھتی ہی نہیں۔ پھر پانی سے اس نے اپنا سارا بدن بھگو لیا۔ ٹھنڈک! اف اس پیڑ کے سایہ میں یہ بھیگے بدن کی ٹھنڈک — کیا کیا چیزیں نہیں چاہیں اس بدن کو — جنگل نہ ہوں تو انسان کیسے جیئے؟

اچانک پیڑ کے سائے سے نکل کر ایک ہرنی چوکڑی بھرتی ہوئی دور نکل گئی۔ پیڑ پر بیٹھے ہوئے دو تین طوطے بول اٹھے "پکڑو — پکڑو"

راجہ یکلخت ہنس پڑا۔ گھوڑا ہنہنایا۔۔۔ راجہ کے سیراب شدہ بدن پر نئے نئے احساسات کی ہریالی اگنے لگی۔۔ کومل کومل دوب جیسی۔۔۔ ذہن میں شاداب خیال ابھرنے لگے۔۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے، وہ تو ایک خواب تھا ملاقات گذر گئی بات گذر گئی وہ تو ایک خیال تھا مرزی مرزی، وشالی، مرزی۔ وشالی مرزی۔ وشالی، وشالی، وشالی؛ وشالی ایک ٹھوس حقیقت۔ آف وشالی تو ایک جیتا جاگتا انتقام ہے۔ وشالی تو ایک جنگ ہے۔ ایک آگ ہے وشالی تو صلائے رسن و دار ہے۔۔ مرد کی مردانگی کی جولانگاہ۔۔۔

آگے بڑھ کر ایک سپاہیانہ انداز میں اپنے گھوڑے کو تھپتھپایا۔ اور سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔

پہر دو پہر میں وہ اپنی بہن کے گاؤں پہونچ گیا۔ ایک مدت کے بعد وہ بہن کے گھر گیا تھا۔ بہن اور بہنوائی نے بڑی آؤ بھگت کی۔ بڑے چاؤ چونچلے رہے راجہ کے۔ اپنے بیاہ کا نیوتا دیا تو بہن بہنوائی دونوں اچھل پڑے بدھائی دی۔ راجہ نے ان کے گھر میں پوری ایک کالی رات گذاری۔۔۔ سوتے میں بار بار یہی خیال خواب بن کر آتا رہا کہ پھر لوٹتے ہوئے، اسی مقام سے اسی راستے سے گذرنا ہے جہاں خواب و خیال کی دنیا والے بستے ہیں۔۔ مرزی بستی ہے۔ وہ کولنا دیش ہو گا۔ کونسی بستی ہو گی۔۔۔ بالکل سورگ جیسی۔۔ رات پوری بھی نہ گذری تھی کہ راجہ نے بہن بہنوائی سے اجازت چاہی اور واپس اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

دیکھا بھالا راستہ، ہر منظر ایسے گذر گیا۔ جیسے ہوا کا جھونکا آ کر گذر جاتا ہے ہر مقام ایسے گذر گیا جیسے کوئی صدا گونج کر ڈوب جاتی ہے ایک ہی رفتار تھی گھوڑے کی۔ اس کی رفتار اور راجہ کے خیالوں کی رفتار میں

پر سورج چمک رہا تھا۔ وہیں وہ ندی بھی تھی جو اب سوکھی سوکھی لگ
رہی تھی۔۔۔ راجہ کے سینے سے کچھ ایسی ہی سانسیں نکلنے لگیں۔ جیسے ہوائیں
دہشت زدہ ہو کر پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ ہو۔۔ ہو۔۔ ہو۔۔
ہر طرف یہی آواز تھی اور اس آواز سے پیدا ہونے والا سناٹا تھا۔۔
نہ وہاں کوئی زمین تھی نہ آسمان، نہ کوئی خیمہ تھا نہ کوئی انسان صرف
ہولانے والی ہوائیں تھیں۔ بے سمت بہنے والی۔۔ زوں۔۔ زوں،
ہو۔۔ ہو۔۔ جیسے رات کے اندھیروں نے ایک جیتے جاگتے رنگین خواب
کو چبا کر چبا کر، نوچ پھاڑ کر ساری فضا میں اچھال دیا ہے۔ زندگی
کا ہر نشان کچلا ہوا ہے کھنڈلا ہوا ہے۔۔ نابکل نابود۔۔

راجہ کے سینے میں ایک غبار سا اٹھا۔ طوفان سا اٹھا۔ اس کے
اندر نیچے سے اوپر ایک جھکڑ چلنے لگا۔۔ اندر ہی اندر زوں۔۔ زوں
ہو۔۔ ہو۔۔ اس نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا تو پیر پھسل پڑا۔۔
وہ اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور ایسی ایڑ لگائی جیسے گھوڑے
کو سخت سزا دینا چاہتا ہو۔ یا اس سے انتقام لینا چاہتا ہو۔ وہ چیخ پڑا
گھوڑا ابھی لپیٹ میں آکر ایک جھکڑ کی طرح نکل پڑا جیسے سارے
راستے کو وہ روند کر رکھ دیگا۔ کچل کر رکھ دیگا۔ راستے میں آنے والی
ہر شے کو نابود کر کے رکھ دیگا۔ زمین سے آسمان تک صرف ایک طوفانی
غبار تھا اور زمین کا سینہ گھوڑے کی ٹاپوں سے دہل رہا تھا۔

جنگل کو جنگل کھا رہے تھے اور راستہ صاف ہو رہا تھا۔

یہ کونسا مقام ہے۔۔ سامنے شفاف ندی ہے۔۔ ندی
کے دونوں کناروں پر ٹھنڈی گیلی ریت ہے اس پر جا بجا بٹ کا پیڑ سا ہے

فرق بھی تھا۔ ٹاپوں کی آواز بھی یکساں تھی۔ اب وہ موڑ قریب آرہا
ہے۔ جہاں سے راستہ اس خواب و خیال کی وادی کی طرف پلٹتا ہے۔
وہ موڑ کتنا قریب ہے۔ ادھر پلٹ جاؤں تو ساری وادی کے رنگ کھل
پڑیں گے۔ ان رنگوں میں لپٹی لپٹائی مرزی میری منتظر ہوگی۔ لیکن اسے کیا
یقین کہ میں پھر لوٹوں گا۔ نہیں اب اگر وہاں سب کچھ ہوگا بھی تو میں اجنبی ہوں گا۔
ایک بوجھ ہوں گا۔ کون سواگت کریگا۔؟ آگے بڑھنا ہے۔ آگے۔ نہیں
دو گھڑی کے لئے ادھر مڑ جاؤ۔ دیکھو۔ یہ موڑ ہے نظر کے سامنے۔
زندگی کا ایک سنگ میل۔ گھوڑے کی رفتار تیز ہوئی تو خیالات کی رفتار بھی
تیز ہو گئی۔ یہاں تھا وہ موڑ۔ یہیں تو سواگت ہوا تھا۔ یہیں تو رنگ بکھرے
تھے۔ پھول کھلے تھے۔ یہیں تو۔ یہیں تو۔ یہ ہے وہ مقام۔ یہاں
کتنا تیز اجالا ہے۔ دھوکہ دینے والا۔ آگے کا راستہ نظر نہیں آتا۔
گھوڑے کو سیدھا دوڑا دو۔ ٹکرا جاؤ اس اجالے سے۔ اور [illegible] آگے
ان اجالوں کے اُدھر وشالا ہے۔ وشالا زندگی کا ایک طویل راستہ ہے
اور مرزی صرف ایک موڑ۔ چلو آگے بڑھ جاؤ۔

گھوڑا موڑ پہ مڑ گیا۔ راجہ نے لگام کھینچی تو اُس کے ہاتھوں میں لگام
ڈھیلی پڑ گئی۔ گھوڑا تیزی سے وادی کی طرف بڑھ گیا۔ اجالوں کی جگہ
راجہ کی آنکھوں میں اندھیرے چھانے لگے۔ گھوڑا بے باک جب آگے بڑھنے
لگا تو پتہ نہیں کس جذبے سے مغلوب ہو کر راجہ گھوڑے سے لپٹ گیا۔ اس کے
ایال میں اپنا چہرہ چھپانے لگا اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

دور دور تک وہی وادی چھپی ہوئی تھی۔ وہی اونچے اونچے پیڑ تھے
جنکے سائے لمبا یونہی ڈول رہے تھے۔ وہ وہی پہاڑی تھی۔ جس کے ماتھے

پیڑ سے ایک سریلی آواز آئی — تمہاری پیاس وہاں نہیں بجھے گی — یہاں آؤ۔" پیڑ تلے ایک اپسرا کھڑی ہے۔ چاندنی جیسے سفید لباس میں لپٹی ہوئی۔ ہوائیں ہلکے ہلکے اڑتے ہوئے ملبوس میں بدن کے تیکھے نقوش نمایاں، نمایاں — اپسرا کے ہاتھ میں ایک سنہری رنگ کی تھالی اور تھالی میں ہلکورے لیتا ہوا — ایک شعلہ اور شعلہ ایک نازک سے ہاتھ کے پیچھے محفوظ۔"

راجہ کو اچانک ہوش آگیا۔ اسکے اندر چلنے والا طوفانی جھکڑ ایک مرکز پر آکر تھم گیا۔ راجہ کے دل کی دھڑکن پر سکون ہو گئی — یہ ندی یہ پیڑ، یہ ہلکی ہلکی چاندنی — وشالی سے پہلی ملاقات۔ مرد کی مردانگی کو للکارنے والا حسن مقابل — اور پھر اعلان جنگ —

بڑ کے پیڑ تلے دو گھڑی راجہ نے اپنا گھوڑا روک لیا — چاروں طرف نظر ڈالی کہیں کوئی نظر نہیں آیا —

اس ساری دھرتی پر کبھی میرا راج ہو جائے تو مجھے کیا ملیگا ؟ میں تو تشنہ ہی رہونگا۔ سارلے۔ آکاش میرے قبضے میں آجائے تو بھی کیا ہوگا۔؟ میں پیاسا ہی رہونگا — لیکن — لیکن میں وشالی کو جیت لوں تو۔؟ آف وہ کیا نشہ ہوگا۔ ہر طرح سیراب ہو جاؤنگا — زندگی کتنا قیمتی نشہ ہے — !

راجہ کا گھوڑا ہنہنانے لگا — راجہ کو بھی کچھ ہنسی آگئی — اس کے اندر تازگی کی ایک لہر دوڑ گئی — وہ ساری راہیں۔ وہ سارے مقام اور وہ ساری منزلیں جن سے وہ گذر کر آیا تھا۔ ان کے تصورات ان کی یاد میں اسکے تیز رفتار خون میں غلطاں ہونے لگیں۔ غلط ملط ہونے لگیں۔

راجہ کو خیال آیا کہ وہ دراصل ایک خیالی دنیا یا پریزادوں کے دیس سے آیا ہے۔ لیکن وہ تو انسان ہے، اسے تو انسانوں کی طرح جینا ہے۔ گھوڑا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ سامنے اس کا اپنا گاؤں تھا۔

(۲۳)

گاؤں کے نقوش آج کتنے تیکھے تھے۔ گاؤں کے چہرے پر جیسے
گلال مل دیا گیا تھا اور اسکے مزاج میں جیسے ایک ترنگ آ گئی تھی
فضا میں گاؤں کے دست و پا پر لگی مہندی کی خوشبو تھی۔ میٹھی میٹھی ہلکی سی
ہلکی گرد و ابھرے لپٹے ہوئے۔ ہواؤں میں کچھ گیت تھے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ
آگے بڑھ رہا تھا۔ راجہ کو یہ خیال آ رہا تھا کہ بستی میں پہنچ کر تو بستی
کے لوگ گلے لگا لیں گے۔ لپٹ جائیں گے ۔۔۔ راجہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔
راجہ نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔۔۔ اس کا جی چاہتا تھا
کہ اس کا رخش جہاں اسے کہیں لے جائے۔ راجہ اس کے حوالے
ہو جائے۔ راجہ کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو۔ اسکی کوئی کوشش نہ ہو۔ گھوڑے
کی پیٹھ پر کسی ہوئی زین پر ڈھیلا ڈھالا بیٹھے ہوئے راجہ نے اپنے پیر
بھی رکاب سے نکال کر یونہی لٹکا دیئے کہ بس اس کا گھوڑا اور وہ دونوں
ایکدوسرے کی بندشوں سے آزاد ہو جائیں۔ بس کسی طرف نکل پڑیں۔
راستے میں اگر کسی دوست سے ملاقات ہو جائے تو اسے گلے لگا لیں
دشمن ملے تو معاف کر دیں۔ گھوڑا بھی من موجی لگتا تھا۔ گاؤں میں داخل
ہوا تو اس راستے جدھر سے سرائے والا چوپال قریب پڑتا تھا۔ راجہ
کے گھر کے لئے ابھی کافی آگے جانا پڑتا تھا۔ چوپال سے دہنی طرف مڑ
جاؤ تو دلہن کا گھر آتا تھا۔ وشالی کا گھر۔ پیپل کے نیچے گھوڑا وہیں
خود ہی رک گیا جیسے مالک سے پہلے خود فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ کدھر

مڑے راجہ کے پیروں میں ایک کو ہجوم سے ارادے کا ارتعاش پیدا ہوا جیسے وہ چاہتا ہو کہ ہلکی ایڑ لگائے اور دہنی طرف گھوڑے کو موڑ دے۔ ذرا گاؤں والے بھی تو دیکھیں کہ کیا سینہ تان کر جا رہا ہے ناٹک۔ لوگ شور مچائیں تو شالی دوڑ کر کواڑ کھولے اور دیکھے کہ راجہ آرہا ہے۔

گاؤں کی ریت ہے کہ ایسے وقت لوگ دھوم مچاتے ہیں۔ بوڑھے بیسل کو شاید راجہ کے ان خیالات کا پتہ چل گیا۔ یا پھر اسے اپنی جوانی کے دن یاد آگئے۔ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بیسل کی ہنسی پر راجہ بھی ہنس پڑا۔ راجہ کے ہنسنے پر گھوڑا سمجھ بیٹھا کہ اس کا مالک اس کی نادانی پر ہنس رہا ہے۔ گھوڑا بائیں طرف پلٹ گیا۔ بائیں طرف راستہ رکھنی کے گھر کو جاتا تھا۔ راجہ نے سوچا یہ دوسرا خواب ہے۔ چلو دیکھ لینگے۔

راجہ گھوڑے کے ساتھ ہولیا۔ اب ایک مدھم سی آنچ اس کے اندر سلگ رہی تھی۔ راجہ نے سوچا۔ ایک دیکھی بھالی، جانی بوجھی عورت بھی بالکل اپنے گاؤں جیسی ہوتی ہے۔ ہر گلی پرانی، ہر گھر پرانا لیکن گاؤں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر رکھنی جیسی عورت تو شاید صدیوں میں ایک پیدا ہوتی ہوگی۔ وہ عورت جو مرد کیلئے نہ کوئی دکھ ہے نہ ذمہ داری۔ بس پیار ہی پیار، عیش ہی عیش اور پھر آزادی۔ یہ بھی مرد کا ایک عجیب خواب ہے جو آدھی رات سے پہلے ہر مرد دیکھتا ہے۔

گھوڑا بھی کچھ کھیا رہا تھا اور مگن رہا تھا جیسے وہ بھی کوئی خواب دیکھ

رہا ہو۔ راجہ کے بدن میں لگی آگ، آج کیوں زیادہ دھواں دھواں تھی۔ جلتے رہنے کے احساس میں تسلسل نہیں تھا۔ اس احساس میں کہیں جھول تھا۔ کہیں آگ کے بجھ جانے کا احساس تھا۔ رکمنی کی شعلہ بدنی سب کچھ جلا ڈالیگی، چلو۔ راجہ نے سوچا اور مسکرا پڑا۔

سامنے رکمنی کا گھر تھا اور راجہ کی نظروں کے سامنے ایسا منظر تھا کہ راجہ کو لگا اسکی آنکھیں بند ہیں۔ پہلی بار راجہ نے دیکھا رکمنی کا گھر بند تھا۔ بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اور در و دیوار پر لکھا نظر آ رہا تھا۔
"میں جا چکی ہوں"۔

راجہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دروازے کے باہر نہیں بلکہ اندر ہے اور اندر بند ہے۔ ایک چھوٹے سے بند مکان میں، اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اور گھر سے باہر وقت کی سانس رکی ہوئی ہے۔
"اُف، رکمنی جیسی شخصیت بھی اپنے اندر کتنی عورت تھی، تہہ در تہہ صرف عورت تھی۔ کہاں گئی ہوگی۔ جنگل جنگل، بستی بستی، دیوانہ وار صرف یہ جاننے کیلئے کہ آخر عورت کیا چاہتی ہے؟ رکمنی تو اس باپ کی بیٹی ہے جس نے جنگل سے بستی کی طرف آکر ایڈیشن دیا تھا۔
"خواہش کو نہ مارو۔ بنا خواہش کا بدن بھو کا ہوتا ہے۔ اور بھوکے بدن میں آتما شانت نہیں رہ سکتی"۔
چلی گئی۔

راجہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ دراصل دروازہ بند تھا یا اسکی اپنی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسے ہر طرف اندھیرا سا لگا۔ ایک اندھے کی طرح وہ اپنا راستہ کھوجنے لگا۔ اس کا گھوڑا تو جیسے دم سادھے

گھوڑا تھا۔ راجہ کے ہاتھ میں اچانک اسکی رکاب آگئی۔ بڑے ہی
بے ڈھنگے انداز میں راجہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور باگ موڑ دی۔
چل بہت دور جاتا ہے۔

انجانے میں اسنے گھوڑے کو ایک چابک لگا دیا۔ گھوڑے
نے جیسے پہلی بار ہتک محسوس کی ہو۔ کچھ اس طرح تیز اور لڑکھڑاتے
انداز میں دوڑنے لگا۔ جیسے کوشش کر رہا ہو کہ راجہ کو اپنی پیٹھ سے
اٹھا پھینکے۔ لگتا تھا سامنے کوئی پیڑ یا پتھر آ جائے تو وہ اس سے ٹکرا کر
لہو لہان ہو جائیگے۔ پیپل کے پاس سے بھی اسی طرح گزر گیا۔ گھوڑا خود اپنے
قابو سے باہر لگتا تھا۔ راجہ گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے آپکو صرف سنبھالے
ہوئے تھا۔ گھوڑے کی گردن سے لپٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یا تو وہ
گھوڑے کی پیٹھ سے اچھل کر دور گر پڑیگا یا پھر گھوڑا کسی پیڑ سے یا کسی
گھر کی دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیگا۔ اسی انداز میں دوڑتے ہوئے
گھوڑا راجہ کے گھر کے سامنے پہونچکر الف ہو گیا۔ راجہ گرتے گرتے
بچا۔ گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے کود پڑا اور سامنے آ کر اسکی گردن سے لپٹ
گیا اور کوشش کرنے لگا کہ رو ٹھے کو منا لے۔ کبھی دلار سے تھپتھپانے
کی کوشش کرتا۔ کبھی اسکے ایال میں اپنا چہرہ چھپا لیتا۔ کبھی اسکی گردن
پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ جانور کی غیرت مندی اور انسان کی شرمساری
کا اتنا دلگداز منظر شاید ہی کہیں نظر آتا ہو۔

(٢٣)

آج کی شام بھی ایک شام تھی جب راجہ کے سینے میں ساری کی ساری اداسی آ گئی تھی۔ کیا وجہ تھا پھر رات آ گئی۔ آج رات راجہ نے محسوس کیا کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔ یہاں تو کوئی چھت ہے نہ دیوار۔ بس ایک خلا ہے اور ہر طرف سے بڑھتا ہوا ایک ایسا اندھیرا جو شاید میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں دراصل کہاں ہوں؟ سارے خلا میں وہ اکیلا تھا۔ ان اندھیروں میں کہیں ایک بھڑکتے دیئے کی لو بھی نظر آتی تھی جس کی مدھم روشنی میں اندھیرے اور گہرے نظر آ رہے تھے۔

آج کی اس تنہائی میں، دماغ کی اس بے رخی میں، اسے اپنے اندر اپنا دل بھی کہیں دور دور لگا۔ بیگانہ سا۔ انجانا سا۔ جیسے وہ اس کی سانسوں کا توازن بگاڑنے کی کوشش کرنے لگا ہو۔

آج راجہ کو بے تحاشا اس کی اپنی مرحوم ماں یاد آ گئی۔ اس خیال میں، اس یاد میں اسے ایک سکون محسوس ہوا اس نے اپ کوشش کی کہ آنکھیں بند کر کے وہ اپنی ماں کے، ماں کی آغوش کے بہت قریب چلا جائے۔ ماں سے کہہ دے — "دیکھ ماں، تیرے لیے پھول لایا ہوں تو بتا دے یہ کیسی ہے؟ یہ رنگین ہے یہ مرزی ہے — یہ دوشالہ ہے ماں تو فیصلہ کر دے ان میں سے کون اچھا ہے۔ بس ماں تو بتا دے اور مجھے زندگی دے دے۔" اچانک گھر میں جلتے ہوئے اس ایک ننھے دیئے کی لو بھڑک اٹھی۔ راجہ کو لگا ماں نے راہ بتا دی ہے۔ پسینے سے شرابور اس کے بدن پر اب دھیرے دھیرے اس رات کے اندھیرے اس طرح اترنے لگے جیسے ان کو اس سے اب بڑی ہمدردی ہے۔ جیسا پیالہ ہے اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اور رات شاید سوتی رہی۔ اسے ایسا ہی لگا۔ کیا خواب ایسے بھی

ہوتے ہیں۔

وہ لمحہ گذر گیا، جیسے وہ رات گذر گئی۔ پھر ایک رات آئی۔ رات کے رنگ بدلے۔ رت صنوبر سے لگی۔ راجہ کو خیال آیا، رات بھی تو ہوئی نہ آخر عورت ذات! کیسی خوش رنگ ہے۔ کالی ہے۔ روپہلی ہے۔ دودھیا لگے ہے، گہری سبز ہے، کہیں سرخ بھی ہے اُف یہ کتنے رنگ ہیں اور کیسے رنگ ہیں۔ میں نے تو کبھی دیکھے نہ تھے۔ آسمان کے اُدھر شاید ایسے ہی رنگ ہوتے ہوں گے۔ اتنے ہی رنگوں میں رنگی ہوئی زندگی ہوتی ہوگی۔ جب یہ رنگ آج نظروں سے گذر رہے ہیں تو رگوں میں ایک سنگیت اترتا محسوس ہو رہا ہے۔ پھر یہ رنگ بدل رہے ہیں تو کانوں میں ایک چیخ گونج رہی ہے کس تیزی سے یہ رنگ بدل رہے ہیں۔ ہاں رکمنی، وہ تو ایک بسنتی رت تھی۔ رت بدل گئی۔ مرزی! ہاں مرزی تو ایک دھنک تھی۔ آسمانوں میں گھل گئی۔ لیکن وشالی!! وشالی تو ایک گھنگھور گھٹا ہے۔ وشالی تو اب برس پڑنے والی ورشا ہے۔ بس یہی سچ پاتا ہے۔ بھیگ جاؤں گا، اپنے تن من بھگوؤں گا۔ اور یہ میرے اندر آج جو ایک نرگ سلگ رہا ہے، اسے بجھا دوں گا۔ لیکن یہ نرگ کس لیے؟ میں نے تو کوئی ایسے پاپ نہیں کیے ہیں۔ میں تو کوئی رشی ہوں نہ منی۔ میرا کردار کیا ہے؟ کردار تو رشیوں، منیوں کا ہوتا ہے۔ کس نے دیکھا ہے ان کے کرموں کو۔۔۔؟ ان کا گیان، گیان ہوتا ہے، گیان میں سوم رس ہوتا ہے، گیان میں کام دیوتا کا آشیرواد ہوتا ہے۔

اُف یہ آج کی رات! یہ کالی کالی آگ سے بھرا نرگ۔ موت سے پہلے مجھے اس نرگ میں کیوں جھونکا گیا۔ ابھی ابھی بس تھوڑی دیر پہلے تو سورگ کی پون مجھے بار بار چھو رہی تھی۔ میرے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ کیسے پاک جھرنوں جیسے خیال تھے۔ جذبے تھے۔ یقین تھے۔ لیکن اب یونہی دیکھتے دیکھتے کیا ہو گیا۔۔۔؟

کیا میں زندہ ہوں؟ یا رُکمنی اور مرزنی نے میرے پران لے لیے ہیں؟ یا پھر یہ ایک طویل خواب تھا جو وشالی سے پہلے میں نے دیکھنا شروع کیا تھا۔ اور آج آنکھ کھل رہی ہے تو وہی وشالی پھر میری نظروں کے سامنے ہے ۔ اگر زندہ ہوں تو کیا زندگی میں ایسے بھی مقام آتے ہیں جہاں سے صرف پیچھے لوٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اُلٹے پاؤں ۔ میں تو بس تھوڑی ہی دیر کے لیے یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ بس زندگی کو یوں دہرالوں تو مجھے منزل مل جائے۔ لیکن منزل کیسے چاہیئے؟ بنا بھٹکے یہاں راہ کہاں ملتی ہے؟ یہ تو ایک گھنا جنگل ہے، باہر نکلنے کا یا تو کوئی راستہ ہی نہیں یا تو نظر کے سامنے کتنے ہی راستے ہیں۔ جنگل میں ہر طرف ایک روشنی پھیل رہی ہے۔ راہیں بتا رہی ہے۔ کسی طرف نکل جاؤ... "جھرنے گیت گاتے ہیں۔ وہ جانتا تھا۔ اُس نے سوچا چلو گیت سنیں۔ وہ جھرنوں کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اچانک صبح کے سورج کی ایک کرن ٹوٹ کر جھرنے کے پانی میں جھلملا گئی ہو۔ اس کی نظر کسی چمکدار شئے سے ٹکرائی، یا جھرنے کا گیت روشنی میں ڈھل گیا۔ بس اس ایک مختصر سے لمحے میں اُس نے جو کچھ دیکھا، دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اُس کے پیروں تلے کھڑکنے والے سوکھے پتوں کی آواز نے اچانک سارے ماحول کو باخبر کر دیا۔ راجہ کی زبان سے نکلا۔" یہ کون ہے؟" آواز کا ایک حلقہ جنگل میں پھیلتا گیا۔

وہاں ایک دیوی تھی جو جھرنے کے پانی میں نہا رہی تھی۔ مرد کی آواز کی ایک ہلکی لہر نے دیوی کی گھنی پلکوں کو اُٹھا دیا۔ دیوی اندر ہی اندر چونک گئی۔ لیکن اُس کے چہرے پر ایک سکون چھایا رہا۔ بس اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا بدن چھپا لیا۔ "تم کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔" یہ وشالی کی آواز تھی۔ "بھگوان نے بلایا ہے مجھے، میں نے سنا ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں بھگوان خود کنیا دان کرتے ہیں۔" اُس کی گہری پلکیں ایک بار اس طرح اٹھیں جیسے اس بار اُس کی نظریں راجہ کے لیے آ در ہو

اس نے نظر پھیر کر جنگل کو دیکھا۔ سارا جنگل آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ راجہ نے کہا
تم مان لو تو بس یہیں بھگوان کی مورتی کے سامنے ایک ہو جائیں اور یہیں بس جائیں۔
وشالی کی آنکھوں میں تبسم آگیا۔ ہونٹوں پہ روشنی سی پھیل گئی۔ جنگل کی ہوا اس کے
بدن سے لپٹ گئی۔ اسے ہلکی تشنگی محسوس ہوئی۔ اس نے کچھ سنبھلنے کی کوشش میں کہا۔
میری ماں ایک دیوی تھی۔ اس کو اس کا پتہ نہیں ملا تھا۔ عجیب بات ہے۔ پیڑوں
پہ بیٹھے ہوئے پرندے فضا میں اڑ گئے۔ راجہ کے دماغ میں ایک خیال بول اٹھا۔
شدید خواہش ہی تو جنون ہوتی ہے۔ راجہ کو جنون تھا کہ وشالی کو فتح کر لے۔ وشالی
تھی بھی کتنی مضبوط اور مغرور عورت۔ وشالی کو دیکھنے کے بعد یہی یقین ہوتا تھا کہ
اس سے آگے عورت کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ وشالی چپ تھی۔ اس کے گیلے بدن
پہ پھیلی ہوئی بوندیں اب چنگاریوں میں بدل رہی تھیں اور پیڑوں کے نیچے پھیلے ہوئے
سوکھے پتوں میں آگ لگنے والی تھی۔ مسکراتی ہوئی وشالی نے اپنے ابروؤں پر طرحداری
کا احساس پیدا کرتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ اسے لگا اس کا بدن اب اس کا بدن نہیں
ہے۔ اس کے بدن پہ ایک دوسرے بدن کا سایہ ہے۔ گہرا۔ راجہ نے وشالی کا
ہاتھ پکڑا اور پہلے لمس کے بعد دوسرے ہی لمحے اس کی گرفت ایک یقینِ محکم بن گئی۔ دو قدم
آگے بڑھ کر دونوں بھگوان کی مورتی کے روبرو کھڑے ہو گئے، دونوں نے بھگوان کو پرنام
کیا۔ آنکھیں بند کیں اور بھگوان سے آشیرواد مانگ لیا۔ دونوں وہاں سے تھوڑی دور
ہٹ آئے۔ دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ وشالی کے سرخ و سنہرے بدن
کا ایک ایک انگ اور ایک ایک ابھار، راجہ کی مضبوط باہوں میں زیادہ عیاں عیاں
ہو گیا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور پھر سارے جنگل میں آگ لگ گئی۔ جنگل سے باہر
نکلنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا

(۳۶)

بیاہ کے بعد راجہ نے وشالی کے ساتھ کیسی معرکہ خیز زندگی گزاری تھی۔ ملک کے بعد ملک فتح کیے تھے۔ کیسے گھمسان کے رن جیتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو آج کتنا بڑا فاتح سمجھتا ہے۔ ایک سچے فاتح کے پاس امن اور شانتی کا کتنا صحیح تصور ہوتا ہے۔ راجہ کے دوش بدوش چل کر، اس کی آغوش میں سج سنور کر۔ بیٹھے ہوئے وشالی نے یہی محسوس کیا تھا کہ زمیں تا فلک سب کچھ محفوظ ہے۔ اور جیون ایک غریب و چنچل پوتر جل کا دھارا ہے۔ بہتا ہے، چٹانوں سے ٹکراتا ہے اور پھر شانت بہنے لگ جاتا ہے۔

~

(۴۵)

آج شادی کا دن ہے۔ شام ہوئی تو شادی کی پھلجھڑیاں چھوٹیں۔ باجے بجے۔ وشالی کے گھر کے سامنے بستی کے لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ کھڑا تھا۔ سب لوگ باہر کھڑے ہوئے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ جیسے اُن کے اور وشالی کے گھر کے درمیان آج پھر مندن آ کھڑا ہوا ہے۔ پھلجھڑیوں کی روشنیوں میں اُس کی آتما تڑپ رہی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ڈر تھا کہ کہیں آج پھر مندن کی آتما کالی ناگن بن کر آ جائے اور راجہ کو ڈس لے۔

لگن منڈپ میں بیٹھے ہوئے راجہ اور وشالی نے ایک دوسرے کو پھول مالائیں پہنائیں۔ شادیانے زور سے بجے۔ ساری بستی اور جنگل گونج اُٹھے۔

بستی کے لوگ دھیرے دھیرے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔ بستی کے مکھیا اور کارندوں نے بھی بڑے شوق سے بیاہ دیکھا۔ دھیرے دھیرے ساری بستی پر خاموشی چھا گئی اور فضا میں پھولوں کی خوشبو بکھر گئی۔

حجلۂ عروسی میں پھولوں کی سیج پر بیٹھے ہوئے وشالی نے بڑے ہی والہانہ اور بے باکانہ انداز میں راجہ کے گلے میں اس طرح اپنی باہیں حمائل کر دیں اور اس طرح اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیا جیسے کہہ رہی ہو۔ "راجہ عورت دراصل اپنی جگہ ایک سلطنت کی حکمران ہوتی ہے۔ میں ایسی ہی ایک عورت ہوں۔ اور آج اپنی سلطنت اور حکمرانی تمہارے سپرد صرف اس لیے کر رہی ہوں کہ تم مجھے جانتے ہو۔"

راجہ نے وشالی کو صرف اس لیے پسند نہیں کیا تھا کہ وہ بہت ہی حسین و جمیل عورت تھی بلکہ اس لیے بھی پسند کیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے بدنام ہو چکی تھی۔

دور جنگل میں۔ سب کچھ چھوڑ دے۔ تجھے وہ جیون دوں گی کہ جنموں تجھے وہ سکھ نہ ملے۔"

راجہ کہہ ہی نہ سکا جیسے اس کا ساتھ دیا ہو نہ دیا ہو۔ لیکن اس کا دھڑکتا دل اس کی زبان بن گیا۔ اس نے کہا۔ "تو یہیں رہ۔ میرے ساتھ۔ میں بھی کسی رسم و رواج سے ڈرتا نہیں۔ میں کسی کا غلام نہیں۔ تو میری بستی میں رہ، میں تیرا بن کر رہوں گا۔"

مرزی تڑپ اٹھی۔ راجہ کو اس طرح دیکھا جیسے آنکھوں سے بہتی ہوئی ایک شدید حسرت کو تھام رہی ہو۔ بولی۔ "مگر۔ وہ تیری کا بیاہتا ہے۔ میں کسی کے ساتھ بہنے والی نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ آزاد رہوں گی۔ تو مجھے پھر نہ جکڑے ان دقیانوسی بندھنوں میں۔ چھی۔ دیکھ ایسا ہو جائے تو مجھے تجھ سے نفرت ہو جائے گی۔ چل اکیلا۔ نہیں تو میں چلی۔ بس تین دن تیرا انتظار کروں گی۔ پھر کبھی کبھی نہیں ملوں گی۔ اگلے جنم میں بھی نہیں۔"

"تو چل میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔"

یہ سن کر ایک بوند مرزی کی آنکھوں سے ٹپک پڑی۔ اس نے کہا۔ "ارے ہٹ۔ اس طرح گھڑی بھر کے اندر فیصلہ کرنے والا مرد، مرد تو ہوتا ہے مگر وفادار نہیں ہوتا۔ تو پھر میرے ساتھ ایک رات گذار کر لوٹ آئے گا۔"

تڑاخ سے راجہ نے مرزی کو ایک چانٹا لگایا۔ مرزی کے گال پہ ایک سرخ پھول کھل اٹھا۔ مرزی راجہ کے قدموں میں گر گئی اور بولی۔

"اچھا راجہ! میں جا رہی ہوں۔ لیکن تیرا انتظار کروں گی۔ ضرور آنا۔ ہمیشہ کے لیے آ جانا۔"

راجہ نے اس کو اس کیفیت میں دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "دیکھا میرا فیصلہ۔"

اچانک مرزی بھاگ کھڑی ہوئی۔ تیزی سے۔ راجہ اس پر جھپٹ پڑا۔۔۔

(۴۷)

تین سال گذر گئے۔

کبھی ایک دن ایسا آجاتا ہے۔ ایک شام ایسی آجاتی ہے۔ یا ایک گھڑی ایسی آجاتی ہے جب کہ وقت ہمارے ساتھ چلتے چلتے اچانک ایک موڑ پر ہم کو چھوڑ دیتا ہے۔ آگے نکل جاتا ہے یا پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ موڑ یا تو ایک سارے کا سارا ماضی بن جاتا ہے یا پھر ایک مستقبل۔ ایسے ہی ایک پل کو، ایک بھری شام، بستی کی ایک چھوٹی سی گلی کے آگے، بوڑھے پیپل کے پاس اچانک راجہ کو مرزی مل گئی۔

مرزی! مرزی! راجہ کو یقین نہیں آیا۔

راجہ کے سارے بدن میں جیسے ایک سورج چمک اٹھا۔ اتنی روشن شام! پہلے تو اُسے کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن ۔ سامنے مرزی تھی۔ وہی مرزی، کچے انار جیسی ایک کٹار جیسی، ہر عضو سے جی جگہ کو کاٹتی ہوئی۔ لیکن اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں راجہ کو دیکھ لینے کا وحشت ناک یقین تھا۔ اُسے پہلے تو کچھ سوجھا ہی نہیں۔ وہ صرف چیخ پڑی جیسے راجہ کا نام بھی اُسے اُس گھڑی یاد نہ آسکا ہو۔ وہ ایک وحشیانہ انداز میں، دیوانہ وار، راجہ پر گر پڑی۔ راجہ نے اُسے سنبھالا نہیں۔ وہ مرزی کے لیے ایک جوش وجذبے سے بھرپور گرما گرم آغوش بن گیا۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آیا دونوں کو۔ پھر مرزی نے بے دریغ کہنا شروع کیا۔ اپنی بھاری بھاری سانسوں کو سنبھالتے ہوئے۔ "میں سچ مچ مرزی ہوں راجہ۔ یقین نہیں آتا تجھے؟ دیکھ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں تجھ سے کہنے آئی ہوں کہ میں آج آزاد ہوں۔ صرف تیرے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ قبیلہ چھوڑا۔ اپنے شوہر کو چھوڑا۔ میں اب ہر بندھن سے، ہر رسم سے آزاد ہوں۔ تو بھی میرے ساتھ چل۔

(۳۸)

میں اس بدنام خاندان کی آخری نشانی اور اس نامور خاتون کا چھوڑا ہوا ایک ورثہ ہوں جس کا وارث پتہ نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں۔
ویسے میری دنیا دوسری ہے۔ میری روشن زندگی میں آج ایسا کوئی سایہ نظر نہیں آتا جس سے کہ کوئی ڈر ہو۔ میری گاؤں کی زندگی اس نئی دنیا کے سنئے آسماں پہ ایک بادل کی طرح چھا کر بنا برسے کھل گئی۔ اور آج نیلا آسمان ہر طرف صاف ہے۔

میری دادی نے مجھے پالا پوسا اور خوب پڑھایا لکھایا۔ پتہ نہیں کیوں؟
آج کالج کی اونچی ڈگریاں میرے پاس ہیں۔ کچھ اتنے فلسفے پڑھے ہیں۔ کچھ اتنی تہذیبوں کی تاریخیں پڑھی ہیں کہ یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد آج ذہن میں بار بار بس یہی خیال آتا ہے۔ دل میں یہی خواہش سر اٹھاتی ہے کہ دوڑتی ہوئی چلی جاؤں۔ رکمنی کے پاس اور سر جھکا دوں اس کے سامنے۔ اور اس سے کہوں "مجھے تو اس دنیا میں صرف تمہارا آشیرواد چاہیئے۔ سب سے سچا۔ صاف اور شفاف کردار تو تمہارا ہے۔ کتنے کھلے انداز میں تم نے اپنے دکھوں کو، اپنی محرومیوں کو زندگی کا مزاج بنا لیا۔ کردار کے چھوٹے تصور کو ٹھکرا کر ایک مہان کردار بن گئیں تم۔ بس بنتی کرتی ہوں تم ــ تم ہی میری ماں بن جاؤ۔ بس یہی شرن میرے لیے سب کچھ ہے۔"
ایک کردار جو جیتا رہا سنگیت کے دھاروں میں۔ غم، خوشی، لذت، ملاپ اور ہجر وصل و فراق۔ ان سارے بندھنوں سے آزاد۔ نہ سماج کا بوجھ نہ دوسروں کی ذمہ داری۔ کہیں بھلا ایسا ہوتا ہے؟ اگر کہیں کوئی ایسا کردار پیدا ہوتا ہے تو فنا سے بچ جاتا ہے۔ اور اس ایک ہی کردار اور ایک ہی ہستی کے نام سے ہزاروں سال زندہ رہتا ہے۔

اٹھتی اُدھر چلی جاتی۔ پھر وقت بیچ میں حائل ہو جاتا۔ پھر اُبھرتی اور دوسری اور چلی جاتی۔ پھر ایک ہوک کی طرح وہ چیخ دھرتی کی کوکھ سے نکلی اور اُوپر کی طرف چلی گئی پھر فضاؤں کو لرزتا چھوڑ کر دُور دُور تک نکل گئی۔ جنگلوں میں، صحراؤں میں، اور پھر ہمیشہ کے لیے سُوکھے، بوسیدہ، کھوکھلے، اُداس پیڑوں سے گذرنے والی ہولناک سرسراہٹ بن گئی۔

وشالی پر مقدمہ چلا۔ ایک ویشیا کو اپنے شوہر کے خون کے بدلے میں قید کی سزا ہوئی۔ اُس نے پندرہ سال جیل میں کاٹے اور پھر ایک دن جیل ہی میں خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

دُکھنی اگر میری ماں بن جائے تو اس کی اجازت لے کر ضرور ایک دن دوڑتی ہوئی جاؤں گی، مرزی کے پاس۔ اور اُس سے کہوں گی "تم بھی تو میری بہت کچھ لگتی ہو۔ بس اتنی سمجھ بوجھ کی مجھے دان دیدو کہ میں بھی جان لوں کہ زندگی ایک جنگلی پون بن کر کس طرح اُڑ سکتی ہے۔ میرے جی کا ارمان ہے کہ ایک رسیلی مگر جنگلی ہیک بن کر زندگی میں کسی ساتھی سے بُری طرح لپٹ جاؤں اور اُسے ساتھ اُڑا لے جاؤں تمہاری طرح۔ تم جسے پیار کہتی ہو، مجھے اپنا کچھ جان کر سینے سے لگاؤ اور میرے انگ انگ میں وہ رس بھر دو، اس میں وہ وِش بھر دو کہ میں یہ جانوں کہ میں بھی کتنی بھرپور زندگی ہوں۔

آہ — سب چلے گئے۔

اب یہ شہر، بھانت بھانت کے لوگ، نت نئے لوگ۔ کئی بھولے بھالے، بھوکی بھوکی نظریں — نئے نئے دھوکے۔ زمانے کے کتنے ہی رنگ میرے ساتھ ہیں۔ کتنے ہی متوالے میرے اطراف منڈلا رہے ہیں۔

یہ دنیا چمن ہے کتنے پھول ہیں اور کتنے بھنورے — بے فکرے، لاپرواہ حسن و عشق کے مارے، کبھی لگتا ہے کہ ان میں سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور میرے ہاتھ کی چوڑیاں جھنجھنا گئی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کچھ ایسے خیال اس رنگین چمن کی خاک بن کر کیوں اُڑنے لگتے ہیں کہ کسی نے میرا ہاتھ اس طرح پکڑ لیا ہے کہ میری چوڑیاں جھنجھنائی نہیں بلکہ ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر کرچیاں بن گئی ہیں اور میرے ہاتھ لہو لہان ہو گئے ہیں۔

لیکن انہی خیالات نے مجھے کچھ ایسی تنہائیوں میں پہنچا دیا جہاں بیٹھ کر میں نے یہ داستان لکھ لی۔ آج یہ خیال بڑا اچھا لگتا ہے کہ جب پیار سے کوئی اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے گا تو اُس ہاتھ میں میں یہ داستان تھما دوں گی۔ ویسے میری ماں نے کہا تھا "کبھی مرد کی محبت جیتنے کی کوشش نہ کرنا، تم ہار جاؤ گی۔"

ختم شد